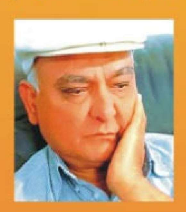
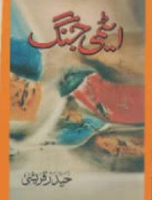
حیدر قریشی کے افسانوں کا مطالعہ

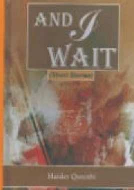
کامران کاظمی کے یونیورسٹی ریسرچ کے دوران ایم فل کورس ورک کا مختصر مقالہ











مرتّب

کلثوم رقیّہ

ایم اے۔ایم فل

حیدر قریشی کے افسانوں کا مطالعہ

کلثوم رقیّہ

Haider Qureshi ke Afsannon ka Mutalea

Compiled By Kalsoom Rouqia

میرے افسانوں پر کامران کاظمی نے اپنے ایم فل کورس ورک کا مختصر مقالہ ڈاکٹر رشید امجد کی نگرانی میں ۲۰۰۶ء میں لکھا تھا۔ یہ مقالہ کتاب کے طور پر چھپنے والا تھا لیکن پھر یہ سارے متعلقین کی اپنی اپنی مصروفیات یا ترجیحات میں گم ہوگیا۔ اب کلثوم رقیّہ نے اس گم شدہ مقالے کو نہ صرف ازسرِ نو دریافت کیا ہے بلکہ اس کی ترتیب و تدوین کر کے اسے شائع کرنے لگی ہیں۔ میرے لئے یہ بڑی خوشی کی خبر ہے۔ میں کلثوم رقیّہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

حیدر قریشی

حیدر قریشی کی شخصیت بہت ہمدرد اور رکھ رکھاؤ کی مالک ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان افسانوں کا جائزہ لینا نصابی ضرورت کا ہی سہی مگر بہت مشکل کام تھا۔ تاہم اسے میرے ساتھ ہر سطح پر حیدر قریشی کے تعاون نے ممکن بنا دیا۔ نصابی ضرورت پوری ہونے کے بعد میرے ذہن میں یہ خیال موجود تھا کیوں نہ اب اس مختصر مقالے کو باقاعدہ کسی کتاب کی شکل دے دوں۔ اس خواہش کا اظہار ڈرتے ڈرتے میں نے حیدر قریشی سے کیا اور ان کی رضامندی بھی حاصل کر لی مگر کیا کروں اس سست طبیعت کا کہ یہ کتاب محض میری وجہ سے تاخیر کا شکار ہوتی رہی۔

حیدر قریشی کا نظریہ زندگی کیا ہے؟ اور کیا وہ اپنے نظریے کو اپنے تخلیقی اظہار کا شعوری لازمہ خیال کرتے ہیں؟ کیا کسی بھی نظریے کو تخلیق میں ضرور اظہار پانا چاہیے۔ چاہے وہ اس تخلیق کا تخلیقی حصہ بن بھی پائے یا نہ بنے؟ یہ سوال گنجلک بھی ہیں اور اختلافی بھی۔ البتہ افسانے کا بنیادی لازمہ کہانی ہے چاہے اس میں نظریہ موجود ہو یا نہ ہو۔ اگر فنکار کا زندگی کے بارے میں نظریہ یا نقطہ نظر اس کی تخلیق میں رچ بس کر آئے اور وہ اس کا تخلیقی حصہ معلوم ہو تو اس میں قباحت بھی کیا ہے۔ یقیناً اسے فوراً مقصدی ادب کہہ دیا جائے گا۔ ادب کا کسی نہ کسی سطح پر کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے کیونکہ ادب کا تعلق اپنے معاشرے سے قریبی نہ سہی 'عملی' ضرور ہے۔۔۔ بات طویل ہوتی جا رہی ہے بنیادی مقصد یہی تھا کہ میں ان کہانیوں کو سمجھنے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ آپ پر ہے اور آپ کی حوصلہ افزائی اور رائے کا منتظر رہوں گا۔

کامران کاظمی

حیدرقریشی کے افسانوں کا مطالعہ

ڈاکٹر کامران کاظمی کا یونیورسٹی ریسرچ کے دوران ایم فل کورس ورک کا مختصر مقالہ

مرتّب

کلثوم رقیّہ

ایم اے۔ایم فل

عکاس انٹرنیشنل پبلی کیشنز۔اسلام آباد

یونیورسٹی ریسرچ کے دوران ایم فل کورس ورک کا مختصر مقالہ

حیدرقریشی کے افسانوں کا مطالعہ از کامران کاظمی

A Study of Haider Qureshi`s Short Stories
By Dr. Kamran Kazmi

نام کتاب: حیدرقریشی کے افسانوں کا مطالعہ

مقالہ نگار: کامران کاظمی

مرتب: کلثوم رقیّہ

سرورق: ارشد خالد

مقالہ کی پہلی اشاعت: عکاس اسلام آباد۔ مارچ 2007ء

قیمت: ۲۰۰ روپے

مطبع:

Published By
AKKAS INTERNATIONAL
House No 1164 Street No 2 Block C
National Police Foundation ,Sector O-9
Lohi Bhair, Islamabad, Pakistan
Tel.0300-5114739 0333-5515412

....

E- Mail:

akkasurdu2@gmail.com

انتساب

اپنی مرحومہ والدہ ریاض بیگم اور

باحیات والدمحترم حاجی محمد یعقوب کے نام

جنہوں نے تمام عمراَن تھک محنت اور دعاؤں سے مجھے اس مقام تک پہنچایا۔

اللہ تعالیٰ دونوں پر دونوں جہان کی رحمتیں اور برکتیں نازل کرے۔آمین

ترتیب

Haider Qureshi's splendid collection of short stories extends the range of contemporary Urdu writing available in English translation. Qureshi is a philosophical story teller who ranges from the Ramayana to ecological fables and reflections on the experience of immigrant workers in Germany.His is a singular voice which deserves a wider audience. These stories are thoughtful and full of interest.

Dr. Derek Littlewood (Birmingham, ENGLAND.

ڈاکٹر ڈیرک لٹل ووڈ

(حیدرقریشی کے افسانوں کے انگریزی ترجمے کی کتاب **AND I WAIT** میں درج رائے)

پیش لفظ

میرے ایم فل کے مقالے بعنوان ''حیدرقریشی کی خاکہ نگاری:ایک جائزہ'' کا دفاعی امتحان ۲۱ اکتوبر ۲۰۲۳ء کو کامیابی سے مکمل ہوا۔امتحان کے بعد ڈاکٹر کامران کاظمی صاحب سے ملاقات ہوئی۔انہوں نے امتحان میں کامیابی کی مبارکباد دی۔جب انہوں نے مجھ سے میرے مقالے کا عنوان پوچھا تو میں نے بتایا کہ میں نے حیدرقریشی صاحب کے خاکوں پر تحقیقی کام کیا ہے تو انہوں نے بتایا کہ انہوں نے بھی حیدرقریشی کے افسانوں پر کام کیا تھا۔یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔

گھر پہنچ کر میں نے حیدرقریشی صاحب کو یہ خوشخبری دینے کے لئے رابطہ کیا تو میں خوشی سے پُر جوش تھی۔میں نے انہیں ڈیفنس کے دوران کا حال بھی بتایا۔ڈاکٹر شیر علی صاحب شعبہ اردو کے سربراہ کی حیثیت سے بہ نفسِ نفیس موجود تھے۔ڈاکٹر فوزیہ تبسم کے کرید کرید کر کئے گئے ذہین سوالات میرے مطالعہ کو جانچ رہے تھے۔مجھے اس وجہ سے خوشی ہو رہی تھی کہ میرا مطالعہ میرے کام آ رہا تھا۔میرے اس مطالعہ میں میرے گھر کے افراد بھی کسی نہ کسی رنگ میں شریک رہے۔

ایم فل کی تیاری کے شروع کے دنوں میں میرے چھوٹے بیٹے نے میرے پاس پڑی کتابوں میں سے ''کھٹی میٹھی یادیں'' کو اٹھا کر دیکھا اور مجھ سے پوچھا کہ ''کھٹی میٹھی یادیں'' سے کیا مراد ہے؟ تو میں نے اسے بتایا کہ محترم حیدرقریشی نے اس کتاب میں اپنی زندگی کی یادوں کو اکٹھا کر کے لکھا ہے تو وہ حیران ہوا اور کہنے لگا جب مجھے صحیح پڑھنا لکھنا آ جائے گا تو میں یہ کتاب ضرور پڑھوں گا۔اسی طرح ہلکے پھلکے انداز میں باتیں ہو رہی تھیں تو میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ آپ یہ کتاب ''میری محبتیں'' ضرور پڑھیں۔انہوں نے مطالعہ کی مشقت سے بچنے کے لئے کہہ دیا کہ

میری نظر پہلے ہی کمزور ہو رہی ہے۔تب میں نے مذاق سے کہا کہ آپ یہ کتاب پڑھیں گے تو آپ کی آنکھوں کی روشنی بڑھ جائے گی۔یہ دو مثالیں یہ بتانے کے لئے لکھی ہیں کہ میرے ایم فل میں میرا سارا گھر بھی کسی نہ کسی طور شریک رہا۔جس سے مجھے تیاری کرنے میں مدد ملتی رہی۔

حیدرقریشی صاحب کی علمی وادبی خدمات اردو ادب کا خزانہ ہیں۔ادب کے قارئین اور خاص طور پر نئے قارئین کو ادب سے جوڑ کر رکھنے والا خزانہ ہیں۔خاکوں پر تحقیقی کام کے دوران میں حیدرقریشی صاحب کی قابلیت کی قائل ہو گئی۔بلاشبہ ان کا ادبی کام سراہے جانے کے لائق ہے۔ان کی تحریر میں انتہائی قوت اور جاذبیت ہے اور ان تحریروں کو پڑھنے کا اپنا ہی مزا ہے۔قاری اپنے مطالعہ کے دوران ان تحریروں کے سحر میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔شگفتگی اور شائستگی دونوں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔کتابوں کے عنوان ہوں یا خاکوں اور یادوں کے عنوان ہوں،عنوان ہی مطالعہ کی طرف راغب کر دیتا ہے۔

بات یہ ہو رہی تھی کہ میں نے حیدرقریشی صاحب کو اپنے ایم فل کی خوشخبری سنانے کے لئے رابطہ کیا اور پھر میں اپنے مقالے سے متعلق دوسری لیکن دلچسپ یادوں کی طرف چلی گئی۔
جب میں نے حیدرقریشی صاحب کو ڈاکٹر کامران کاظمی صاحب سے ملاقات کی بات بتائی تو انہیں بھولی ہوئی بات یاد آئی۔انہوں نے بتایا کہ ہاں کامران کاظمی صاحب نے مقالہ لکھا تھا۔ایک موقعہ پر اس مقالہ کو کتابی شکل میں چھاپنے کا پروگرام بھی بنا تھا۔تب کامران کاظمی صاحب نے اپنی طرف سے ''بیانِ صفائی'' لکھ کر بھیج دیا تھا۔لیکن پھر ہر کوئی اپنی دوسری مصروفیات میں الجھ گیا اور یہ کام تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔میں نے کہا کہ اگر وہ سارا مواد مل جائے تو مجھے اس کی روشنی میں ایک کتاب مرتب کرنے کا موقعہ مل جائے گا۔میرے ارادہ کو دیکھتے ہوئے حیدرقریشی صاحب نے مجھے دستیاب مواد ڈھونڈ کر بھیج دیا۔اب میں اسے اپنی سوچ کے مطابق مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کر رہی ہوں۔

ڈاکٹر رشید امجد صاحب کی وجہ سے کامران کاظمی صاحب کو حیدرقریشی صاحب کے افسانوں پر مقالہ لکھنے کا موقعہ ملا تھا اس لئے حیدرقریشی کے افسانوں پر ڈاکٹر رشید امجد صاحب کا

ایک مضمون شروع میں شامل کرلیا ہے اسے بھی کتاب کا پیش لفظ سمجھا جائے۔حیدرقریشی صاحب کے افسانوں کی فہرست سے قارئین کو سارے افسانوں کے بارے میں معلومات کی سہولت ہو جائے گی۔ویسے تو بیشتر افسانے کامران کاظمی صاحب کے مقالہ میں زیرِ بحث آ چکے ہیں۔لیکن حیدرقریشی صاحب کے آخری تین افسانوں کو سمجھنے میں مجھے کچھ مشکلات پیش آ رہی تھیں۔میں نے اس سلسلے میں حیدرقریشی صاحب کو اپنی مشکل سے آگاہ کیا۔ان افسانوں کے بارے میں چند وضاحت طلب سوال کئے۔حیدرقریشی صاحب نے کرم کیا برا منانے کی بجائے میرے سوالوں کے جواب میں پورا مضمون لکھ دیا۔اس مضمون سے مجھے روشنی ملی ہے۔امید کرتی ہوں کہ ان کا مضمون ان کی افسانہ نگاری کی تفہیم میں مفید ثابت ہوگا۔اس کتاب کے آخر میں حیدرقریشی صاحب کے افسانوں پر چند اہم اہلِ قلم کے تاثرات بھی شامل کر دیئے ہیں۔ان تاثرات سے حیدرقریشی کی افسانہ نگاری کے بعض اور پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔

میں خوش ہوں کہ مجھے الحمد اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد سے حیدرقریشی صاحب کی خاکہ نگاری پر تحقیقی کام کر کے ایم فل کرنے کا موقعہ ملا ہے۔اب ساتھ ہی ایک کھوئے ہوئے تحقیقی کام کو ڈھونڈ کر حیدرقریشی صاحب کی افسانہ نگاری پر بھی کچھ کام کرنے کا موقعہ مل رہا ہے۔

ایک اہم بات یہ بھی کہ دیارِ مغرب میں بیٹھ کر بھی حیدرقریشی صاحب اردو ادب کی جو آبیاری کر رہے ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔یہ کوئی رسمی سا جملہ نہیں ہے جو کوئی حیدرقریشی صاحب کے ادبی کام کو دیکھنے بیٹھے تو معیار کے لحاظ سے بھی اور مقدار کے لحاظ سے بھی ان کا کام سب سے الگ اور سر بلند دکھائی دیتا ہے۔یہ ان کا سب سے بڑا علمی اور ادبی اعزاز ہے۔

میں الحمد اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ اردو کے سربراہ ڈاکٹر شیر علی صاحب کی بہت شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے حیدرقریشی صاحب کی خاکہ نگاری کی راہ سجھائی اور اس سلسلہ میں میری ہر طرح رہنمائی اور مدد فرمائی۔میں اپنے مقالہ کے نگران ڈاکٹر ناصر آفریدی صاحب کی بہت شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ایک اچھے نگران کی طرح میرے ایم فل کے مقالے کی تکمیل میں میری رہنمائی کی۔میں اپنی ممتحن ڈاکٹر فوزیہ تبسم صاحبہ کی بھی شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے مجھے ایک

طرح سے علمی و ادبی دنیا میں کام کرنے لئے تحریک بخشی۔آپ تینوں کے لئے دل کی گہرائی سے دعائیں کرتی ہوں۔

آخر میں اپنی خوشی کی یہ بات بھی بتانا چاہوں گی کہ حیدرقریشی صاحب کی گیارہ کتابوں کا مجموعہ ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' میرے پاس موجود ہے۔اس میں ان کے پانچ شعری مجموعے اور تخلیقی نثر کے چھ مجموعے شامل ہیں۔خاکوں کا مجموعہ ''میری محبتیں'' اور یادوں کا مجموعہ'' کھٹی میٹھی یادیں'' بھی اس میں شامل ہیں۔یہ مجموعہ ۲۰۰۹ء کا مطبوعہ ہے اور اس کے بعد حیدرقریشی صاحب نے ''کھٹی میٹھی یادیں'' کے مزید ابواب بھی لکھے تھے جو اس کتاب کے الگ عوامی ایڈیشن میں شامل ہیں۔چنانچہ میرے پاس یہ الگ کتاب بھی موجود ہے۔یہ کتابیں میرے کمرے میں سجی ہوئی ہیں۔لیکن صرف سجاوٹ کے لئے نہیں ہیں بلکہ میں انہیں بار بار پڑھتی رہتی ہوں۔بار بار مطالعہ کے نتیجہ میں ہر بار مجھ پر حیدرقریشی صاحب کی نگارشات کا کچھ نہ کچھ نیا منکشف ہوتا رہتا ہے۔ان تحریروں میں بڑی جان ہے۔جیسے جیسے پڑھتے جائیں ویسے ویسے نئے جہان کھلتے چلے جاتے ہیں۔ہر کہانی کے اندر ایک کہانی ہے جو حیدرقریشی صاحب کی ظاہری و باطنی کیفیات کے اَسرار سامنے لاتی چلی جاتی ہے۔

مجھے امید ہے میری مرتب کردہ اس کاوش کو ادبی دنیا میں پسند کیا جائے گا۔

کلثوم رقیّہ

چکوال۔یکم نومبر ۲۰۲۳ء

ڈاکٹر رشید امجد (اسلام آباد)

حیدرقریشی کی افسانہ نگاری

حیدرقریشی نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا ہے:

''میری زندگی کے سارے نشیب وفراز لاشعوری طور پر میرے شعور کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں لہٰذا میری عملی زندگی میں پیش آنے والے مسائل اور سوالات ہی میرے کسی نظامِ فکر کی تشکیل کا باعث بنے ہوں گے اور لاشعوری طور پر سہی کسی نہ کسی رنگ میں میری تخلیقات میں درآئے ہوں گے۔''

(جواز جعفری سے گفتگو
مشمولہ **حیدر قریشی کے انٹرویوز** مرتب سعید شباب)

حیدرقریشی کے اس اقرار کے باوجود کہ انہیں تصوف سے دلچسپی ہے، ان کی کہانیوں کا خام مواد حقیقی زندگی کے منظر نامہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ تصوف درویشی اور کسی حد تک گوشہ نشینی کا احساس دلاتا ہے لیکن اگر تصوف کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اپنے وقت کے تمام بڑے صوفی، اپنے عہد سے پوری طرح جڑے ہوئے ہیں۔ کسی نے درست کہا ہے کہ ان کی محفلیں عوامی دربار تھے جن میں ہر شخص اپنے مسائل کے ساتھ موجود ہوتا تھا۔ روحانیت ان کا باطنی سفر تھا، گویا وہ دو دنیاؤں میں رہتے تھے۔ حیدرقریشی کے افسانوں پر بات کرتے ہوئے، یہ ذکر یوں ہوا کہ حیدر قریشی بھی دو دنیاؤں کا مسافر ہے، ایک اس کا باطنی مکاشفہ اور دوسرے اردگرد کی دنیا کا عملی تجربہ۔ چنانچہ اس کی کہانی دو سطحوں پر اپنی تفہیم کراتی ہے، اس کا خمیر اپنے عہد کی سماجی وسیاسی صورتِ حال

سے اٹھتا ہے اور فکری طور پر وہ ایک اَن دیکھی دنیا کے اسرار بھی رکھتی ہے کہ قاری جس سطح پر چاہے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔

حیدرقریشی نے متعدد بار کہا ہے کہ میں خوابوں اور حقیقتوں کے درمیان زندگی بسر کررہا ہوں، پرانی اصطلاحوں میں وہ بیک وقت حقیقت اور آدرش کے درمیان کہیں جینے کی کوشش کررہے ہیں۔ ایک حوالہ سے یہ مسلسل عذاب اور سلگتے رہنے کی صورت بھی ہے کہ حقیقت اور آدرش دو مختلف منطقے ہیں۔ صرف حقیقت کو سب کچھ سمجھ لینے والا خوابوں سے محروم ہو جاتا ہے اور ہمیشہ خوابوں میں رہنے والا حقیقت سے دور ہو جاتا ہے۔ سچا ادیب ان دونوں کے درمیان درمیان ہوتا ہے۔ حیدرقریشی کی کہانیاں اپنے عہد کی سچائیاں ہیں لیکن ان کی اندرونی پرتوں میں خوابوں کی لذت بھی موجود ہے، جو ہر بڑے ادیب کا خاصہ ہوتی ہے۔

حقیقت اور خوابوں کے درمیان جو کشمکش ہے وہی زندگی ہے، اس حوالے سے حیدر قریشی کے تخلیقی عمل کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی ہر کہانی میں دو سطحوں پر موجود ہیں، اول معاشرے کے ایک نقاد اور دوسرے معاشرے کی موجود صورتِ حال سے اوپر اٹھ کر تخلیقِ انسان کے بنیادی مسائل پر غور وفکر کرتے ہوئے ایک صوفی کی حیثیت سے، اس کا اظہار بھی دونوں طرح ہوا ہے۔ ان کی بعض کہانیاں سیدھے سادے معاشرتی مسائل سے متعلق ہیں اور ان کا بیانیہ بھی تفہیم کی کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا، لیکن ان کی بعض کہانیوں کے موضوع گنجلک اور باطنی کشف کی روداد ہیں۔ ایسی کہانیوں کے بیانیہ میں انہوں نے اسطور کے ساتھ ساتھ مذہبی کتابوں خصوصاً بائبل کے اسلوب کی پیروی کی ہے۔ بشارت ان کے یہاں ایک خاص استعارہ بھی ہے اور سچائی کی راہنمائی کرنے والی ایک علامت بھی۔

فرحت نواز نے اپنی ایک گفتگو میں کہا ہے کہ ''حیدرقریشی اپنی تمام تخلیقات میں خود سانس لیتے ہوئے اور زندگی بسر کرتے ہوئے موجود ہیں۔ خود اس طرح کہ ان کی اپنی زندگی کے ساتھ ان سے وابستہ تمام اہم کردار بھی ان کی تخلیقات میں موجود ہیں، بعض کھلی کتاب کی طرح ہیں لیکن ایسی کھلی کتاب جس کے معانی مسلسل کھلتے چلے جاتے ہیں۔'' یہ رائے حیدرقریشی کی

حقیقت نگاری کے رویے کی تائید کرتی ہے۔ ہر لکھنے والا سب سے پہلے ایک ماحول اور ایک معاشرے میں زندہ ہوتا ہے۔اس کی محبتیں ،دشمنیاں اورنفرتیں اس کے لائحہ عمل کا تعین کرتی ہیں اور بعض کرداروں کو محبت اور بعض کو نفرت کا استعارہ بناتی ہیں۔قریب کے جاننے والے بعض اوقات ان میں سے اصل چہرے بھی ڈھونڈھ لیتے ہیں لیکن دور بیٹھا قاری سارے نتائج کو اپنے آس پاس کے ماحول پر منطبق کر کے دیکھتا ہے یہ آفاقی سچائیوں کے زمرے میں آتا ہے کہ کسی کہانی کار کے کردار ان کے عمل اورافکار کس حد تک دوسروں کے لیے قابل قبول ہوتے ہیں لیکن یہ صرف کہانی کی اوپری پرت ہے۔ ہر کہانی کے اندر ایک اور کہانی ہوتی ہے اور جو افسانہ نگار کہانی کی ظاہری سطح کے اندر ایک اور کہانی پیدا کر دینے کا فن جانتا ہے وہ بڑا افسانہ نگار ہے،حیدرقریشی کی اکثر کہانیوں میں یہ خوبی موجود ہے۔یہی وجہ ہے کہ فرحت نواز نے اگر ایک طرف حیدرقریشی کی کہانیوں کی حقیقی صورت حال کا ذکر کیا ہے تو ڈاکٹر سعادت سعید کے نزدیک ’’حیدرقریشی نے دور جدید کے سائنسی اور تکنیکی انقلاب اور تہذیب نو کی کنہ کی تنقیدی تفہیم کی ہے۔‘‘

سچا ادیب آگہی کی جس اذیت سے گزرتا ہے اس کا اظہار حلاج کی طرح ہو جائے تو موت کا پھندا ہر وقت منتظر ہے اور اظہار نہ ہو تو سچائی کا کرب اندر ہی اندر کاٹتا رہتا ہے، توڑتا رہتا ہے۔ اس اندرونی توڑ پھوڑ کا اظہار کس سطح پر ہو یہی ادیب کے مقام کا تعین کرتا ہے،خود حیدرقریشی کو بھی اس کا احساس ہے ڈاکٹر وزیر آغا سے ایک گفتگو میں انہوں نے کہا’’ لکیر کے فقیر معاشرہ میں آزادانہ غور وفکر کرنے والوں کے لیے ایک طرف آگہی کی اذیت ہوتی ہے اور دوسری طرف معاشرے کی ملامت۔۔‘‘۔۔اور یہ تو بالکل سچ ہے کہ آگہی کی اذیت ہی سے گزر کر بڑا ادب تخلیق ہوتا ہے۔اب اس حوالے سے حیدرقریشی کی کہانیوں کو دیکھ لیں تو صورتِ حال واضح ہو جاتی ہے۔ ان کی کہانیاں بظاہر سیدھی سادی ہوں یا کسی فکری مکاشفہ کی دریافت ان میں آگہی کا کرب پوری طرح موجود ہے،یہی ایک سچے فنکار کی پہچان اور جواز ہے۔

ہر فنکار کے ذاتی کوائف کسی نہ کسی حوالے سے اس کے فن پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کی فکر کا تعین بھی کرتے ہیں۔کسی ایک ملک میں رہتے ہوئے ہر ادیب ایک عذاب سے گزر رہا

ہوتا ہے کہ اس کے آس پاس جو بے انصافی ہو رہی ہے اس کے مداوے کے لیے وہ کیا کرے۔ وہ اپنے آپ سے بھی لڑتا ہے اور معاشرے کی مجموعی خرابیوں کے خلاف بھی آواز اٹھاتا ہے۔ٹوٹتا ہے، جڑتا ہے اور اپنا اظہار کرتا رہتا ہے لیکن حیدرقریشی کو دوہرے عذاب سے گزرنا پڑا ہے۔ ۱۹۹۲ء میں اسے وطن چھوڑنا پڑا اس کے بارے میں جواز جعفری کے اس سوال کے جواب میں کہ ’’آپ نے بخوشی وطن چھوڑا یا جلاوطن کیے گئے‘‘ حیدرقریشی نے کہا’’ جلاوطن تو نہیں کیے گئے لیکن وطن کو بخوشی نہیں چھوڑا۔‘‘ وہ بڑی فراخ دلی سے اپنی جلاوطنی کو’’خود ساختہ‘‘ کہتے ہیں۔ یہاں اس جلاوطنی کا تجزیہ کرنے کی گنجائش نہیں لیکن اس دوہری اذیت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جس سے حیدرقریشی گزرے ہیں،شاید ابھی تک گزر رہے ہیں۔۔۔ پاکستان چھوڑنے سے پہلے ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ ’’روشنی کی بشارت‘‘ شائع ہو چکا تھا۔اس مجموعہ کے ایک افسانہ پر وہ صورتِ حال پیدا ہوئی جس کی وجہ سے انہیں ملک چھوڑنا پڑا۔صورت حال تو کئی برس سے موجود تھی اس حد تک کہ حیدرقریشی کو روزگار سے محروم ہونا پڑا لیکن یہ ایک افسانہ جواز بن گیا۔

’’روشنی کی بشارت‘‘ ایک استعاراتی نام ہے۔اس مجموعے کی کہانیاں دونوں سطحوں پر معنوی پرتیں کھولتی ہیں۔سیدھی سی کہانیاں بھی عام معنوں میں اکہری نہیں۔سادہ معنویت میں بھی ان کا جواز موجود ہے۔اس مجموعہ کی جو کہانیاں فکری دبازت کا پہلو لیے ہوئے ہیں ان کا اسلوب بھی نیم استعاراتی ،استعاراتی اور کہیں علامتی ہے۔ان میں اساطیری اسلوب کی جھلک بھی ہے اور کتاب مقدس کے بعض استعارے بھی اپنے عصر سے جوڑے گئے ہیں۔جدید افسانے میں اس مجموعہ کی اہمیت ہے اور جدید افسانے کے ذکر میں اسی کا حوالہ ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ناصر عباس نیّر نے ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے کہا ہے کہ ستر کی دہائی والی نسل نے اوّلاً جدیدیت کے اثرات قبول کیے اور بعدازاں اس جدیدیت کا محاسبہ کیا۔محاسبہ کرنے والوں میں حیدرقریشی بھی شامل ہیں۔اس میں شک نہیں کہ جب کوئی تحریک یا رجحان فیشن کی طرح مقبول ہوتا ہے تو اصل اورنقل کا فرق مشکل ہو جاتا ہے۔ ہر بڑی تحریک کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں کتنے ہی لوگ صرف نقادوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ترقی پسند بن بیٹھے

تھے یہی کچھ ساٹھ کے بعد بھی ہوا لیکن ستر میں محاسبہ کرنے والے ستّر کے بعد کے لوگ ہی نہیں خود ساٹھ کی دہائی کے اچھے لکھنے والے بھی اپنا محاسبہ کر رہے تھے، پھر یہ کہ خارجی منظر نامہ میں ایک بڑی تبدیلی آئی تھی۔ موضوعات کے حوالے سے اور وہ کہانی جو ترقی پسند تحریک کے زمانے میں بالکل خارجی اور ساٹھ کی دہائی میں ردِعمل کے طور پر باطنی ہوگئی تھی، ستّر میں مجموعی طور پر خارج اور باطن کے امتزاج کی صورت ظاہر ہوئی اور صرف ستّر کے بعد کے لکھنے والوں کی سوچ نہیں تھی، خود ساٹھ کے لکھنے والے جواب مستحکم ہو گئے تھے اور عجزِ فن کی منزل سے بھی نکل آئے تھے، اس تبدیلی کے محرک تھے۔ انتظار حسین، انور سجاد، خالدہ حسین اور منشا یاد کی ساٹھ اور ستّر کی کہانیوں میں یہ تبدیلی دیکھی جا سکتی ہے، اس لیے یہ دعویٰ کہ یہ تبدیلیاں ستّر کی نسل کی دین ہیں، درست نہیں، انہیں کسی ایک نسل کی بجائے مجموعی اور عصری ارتقاء کے حوالے سے دیکھا جانا چاہیے۔

حیدر قریشی کا پہلا افسانوی مجموعہ ۱۹۹۲ء میں چھپ گیا تھا۔ اس مجموعے کی کہانیاں ''میں انتظار کرتا ہوں''، ''روشنی کی بشارت''، ''حوا کی تلاش''، ''اپنی تجرید کے کشف کا عذاب'' اور ''ایک کافر کہانی'' اپنے عنوانات ہی سے اپنی فکری سمت کا تعین کرتی ہیں، ان کہانیوں میں تصوف کی وراثت کہانی کے باطن میں موجود ہے۔ اسلوب کے حوالے سے بھی یہ کہانیاں دبیز اسلوب کی ذیل میں آتی ہیں۔ جب یہ مجموعہ چھپا تھا اس وقت بھی اسے جدید اور اردو افسانہ میں شامل کیا گیا تھا۔

حیدر قریشی کا دوسرا مجموعہ ''قصہ کہانیاں'' (پہلے مجموعے کی کہانیوں سمیت ''افسانے'' کے نام سے) ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔ ہر جینوئن ادیب کا دوسرا مجموعہ پہلے مجموعے سے اگلا قدم ہوتا ہے، سوچ کے حوالے سے بھی اور اسلوب کے حوالے سے بھی لیکن ان میں ایک باطنی تسلسل بھی ہوتا ہے جو ادیب کی بنیادی پہچان ہے۔ حیدر قریشی کے دوسرے مجموعہ میں بھی کئی کہانیاں ان کے پہلے مجموعہ کے فکری تسلسل اور ایک قدم آگے کے سفر کی روداد ہیں، مثلاً ''دو کہانیوں کی ایک کہانی'' میں ''منطق الطیر'' بھی موجود ہے اور شاہ جی کے روپ میں ایک صوفی بھی جو قدم قدم اپنے مرید کی فکری راہنمائی کرتا ہے۔

حیدر قریشی کو فکری طور پر میں ایک جدید ترقی پسند افسانہ نگار سمجھتا ہوں کیونکہ ان کے افسانے سماجی زندگی کے خمیر سے تیار ہوتے ہیں اور معاشرے کے دکھ اور مظلوم کی بے بسی ان میں موجود ہے اس حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے موضوعات ترقی پسند ہیں اور معاشرے کو بدلنے کا آدرش رکھتے ہیں لیکن انہوں نے اپنی کہانیوں کو سیدھے بیانیہ میں پیش نہیں کیا بلکہ تخلیقی تجربے سے گزر کر ان کے لیے اظہار کی ایسی زبان وضع کی ہے جس میں استعارہ اور علامت دونوں موجود ہیں بلکہ اکثر انہوں نے تصوف کی اصطلاحات اور اساطیری حوالوں سے بھی کام لیا ہے جو انہیں جدید بناتے ہیں۔ حلقہ اربابِ ذوق نے موضوع کے ساتھ ساتھ فن پارے کی ادبی حیثیت کو بھی ضروری قرار دیا تھا۔ سات اور بعد کی ادبی نسلوں کی تربیت زیادہ تر حلقہ ہی میں ہوئی ہے۔ حیدر قریشی بھی فکری طور پر حلقہ ہی کے پروردہ ہیں اس لیے ان کے افسانوں میں موضوع کی وسعت کے ساتھ ساتھ فنی حوالے بھی موجود ہیں اور وہ فنی جمالیات کے پوری طرح قائل ہیں۔

حیدر قریشی شاعر بھی ہیں، شاید افسانے کی طرف وہ بعد میں آئے ہیں۔ شاعر ہونے کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کا جملہ شعری خوبیوں یعنی لفظوں کے دروبست، اختصار، معنوی دبازت اور تخلیقی جمالیات سے آراستہ ہے۔ ادھر کچھ عرصہ سے انہوں نے باقاعدہ تنقید بھی لکھی اور یادداشتوں کے ساتھ ساتھ مختلف بین الاقوامی موضوعات کو بھی اپنایا ہے، یہ ان کی ہمہ جہتی کا اظہار ہے لیکن میرے نزدیک ان کی دو حیثیتیں زیادہ نمایاں ہیں، ایک شاعر اور دوسرے افسانہ نگار، یہ دونوں تخلیقی حیثیتیں ہیں اور غیر محسوس طور پر ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتی ہیں۔ حیدر قریشی کے افسانوں کا اختصار، جملہ کی گرفت، ہر جملے کا دوسرے جملے سے ایسے جڑا ہونا جیسے زنجیر کی کڑیاں ہوں، مترنم لفظوں کا انتخاب اور کہانی کی مجموعی بُنت میں ماورائی تخلیقی ذہن، ان کی شاعر ذات کی دین ہے۔

حیدر قریشی کے دونوں افسانوی مجموعے ان کے فنکارانہ سفر کے دو مرحلے ہیں ان میں ایک فنی اور فکری ارتقاء ہے جو ان کی اگلی منزل کی نشاندہی کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو افسانے کے مجموعی سفر میں بھی یہ دونوں مجموعے اپنی اہمیت اور پہچان رکھتے ہیں۔

☆☆☆☆

بیان صفائی

میں ذاتی طور پر بہت سست انسان ہوں۔شاید آپ یقین نہ کریں مگر ایسا حقیقت ہے کہ افسانے لکھتا ہوں اور باوجود دو سال تک حلقہ ارباب ذوق راولپنڈی کا سیکریٹری رہنے کے میرے ساتھ ہوٹل کی میز پر بیٹھنے والے میرے دوستوں کو بھی اس کا علم نہیں ہے۔اوراس سستی کے عالم میں مجھے ایم فل بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ڈاکٹر رشید امجد نہایت شفیق اور مہربان شخصیت کے علاوہ ہر دلعزیز استاد بھی ہیں اور وہ اپنے طلبہ کے مزاج سے بخوبی آشنا بھی ہیں۔ایم فل کے کورس ورک میں طلبہ کو کچھ مختصر مقالے لکھنا ہوتے ہیں ایسے ہی ایک دن مجھے اچانک ڈاکٹر صاحب نے ایک کتاب ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' تھمادی اور حکم صادر کیا کہ اس پر مقالہ لکھ لاؤ۔کتاب کیا تھی ایک پنڈورا باکس کھل گیا۔یوں میں حیدرقریشی سے پہلی بار ان کی کہانیوں میں متعارف ہوا۔مختلف ادبی رسالوں میں افسانوں پر چھپنے والے تنقیدی مضامین میں تو گاہے بگاہے ان کا نام پڑھ رکھا تھا مگر جب تک ہم کسی تخلیقی فنکار کے تخلیقی کام سے آشنا نہیں ہوتے اس پر ہونے والی تنقید کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔سچی بات تو یہ ہے کہ ان افسانوں نے مجھ پر ایک تحیّر سا طاری کر دیا۔کافی دن گذر گئے تو میں ایک دن کلیات اٹھائے ڈاکٹر صاحب کے حضور پیش ہوا کہ آپ ہی رہنمائی کریں میں تو ان کہانیوں کا کوئی ایک سرا پکڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔تب انھوں نے ان کہانیوں میں موجود کچھ اہم مسائل کی نشاندہی کی اور میں یہ سمجھا کہ اب راستہ آسان ہو گیا مگر ایسا کہاں تھا۔اب اس تحیر نے دائرہ پھیلا لیا۔اس مشکل کا کیا اپائے ہو؟ ایک آسان اور لگا بندھا طریقہ تو یہ ہے کسی افسانہ نگار کے بارے میں دوسرے ''ثقہ بند'' ناقدوں کی رائے میں کچھ ردو بدل کر لیا جائے۔آسانی کون نہیں ڈھونڈتا؟ میں نے بھی افسانے پر تنقید کی کافی کتابیں چھان ماریں مگر چھان بورا

ہی ہاتھ لگا سو خود کو اسی پہلے قدم پر کھڑا پایا۔آج کل کیا جب سے ادب پر ایک خاص گروہ کا قبضہ ہوا ہے تنقید و تاریخ میں صرف انہیں کا نام لیا جاتا ہے جو بیعت ہیں۔ورنہ تو گذشتہ ۴۵ سال منٹو کا بھی ذکر نہیں ہوا خیر وہ تو تخلیق کار ہی بڑا ہے اور کسی کا کوئی چارہ نہیں چلتا۔حیدرقریشی کا تعلق کسی بھی ادبی مجاوروں کے گروپ سے نہیں ہے تو ان کا ذکر خیر کیوں ہو؟ بس کہیں کہیں ''جہاں زوروں سے منوایا گیا ہوں''۔

کچھ ایسا بھی ہے کہ ادبی مراکز سے دور بیٹھے تخلیق کار نظر انداز ہوتے ہی رہتے ہیں۔اور ان مراکز سے دوری ملک کے اندر ہو یا بیرون ملک ہو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

حیدرقریشی کی شخصیت بہت ہمدرد اور رکھ رکھاؤ کی مالک ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ ان افسانوں کا جائزہ لینا نصابی ضرورت کا ہی سہی مگر بہت مشکل کام تھا۔تاہم اسے میرے ساتھ ہر سطح پر حیدر قریشی کے تعاون نے ممکن بنادیا۔نصابی ضرورت پوری ہونے کے بعد میرے ذہن میں یہ خیال موجود تھا کیوں نہ اب اس مختصر مقالے کو باقاعدہ کسی کتاب کی شکل دے دوں۔اس خواہش کا اظہار ڈرتے ڈرتے میں نے حیدرقریشی سے کیا اور ان کی رضامندی بھی حاصل کر لی مگر کیا کروں اس سست طبیعت کا کہ یہ کتاب محض میری وجہ سے تاخیر کا شکار ہوتی رہی۔

حیدرقریشی کے ہاں افسانہ کے معنی کیا ہیں اور وہ افسانے سے کونسی سماجی ضروریات کا ادراک کر کے اسے تخلیقی اظہار کا حصہ بناتے ہیں۔اور وہ اس میں کتنے کامیاب رہے ہیں یہ تو ان کے قاری زیادہ بہتر جانتے ہیں۔بطور ایک طالب علم کے میں ان افسانوں کی تفہیم کہاں تک کر سکا ہوں اور افسانے پر تنقید کے حوالے سے مجموعی اردو افسانے میں حیدرقریشی کے افسانوں کے موضوعات کو کس حد تک سمجھ سکا ہوں اس کا فیصلہ بھی حیدرقریشی کے قارئین پر چھوڑتا ہوں۔اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے قارئین کی تعداد اچھی خاصی ہے اور ان کی رائے صائب ہے۔

کسی افسانوں کی کتاب پر اسقدر طویل تبصرہ میرا پہلا تجربہ ہے۔میں نہ تو کوئی نقاد ہوں اور نہ ہی آئندہ نقاد بننے کا ارادہ رکھتا ہوں۔اس لیے میری ان معروضات کو کسی نقاد کی رائے نہ سمجھا جائے اور نہ ہی میں ایسا کوئی صاحب مطالعہ شخص ہوں کہ ان افسانوں کی تمام سمتوں کا سراغ

لگا سکتا اور حیدر قریشی کے نمایاں رجحانات کا ادراک کر سکتا۔ تاہم ایک خواہش تھی اور اس کی تکمیل کے لیے اپنی سی کوشش بھی کی ہے البتہ اپنی ناکامی کا اعتراف خود مجھے ہے۔ اگر کہیں حیدر قریشی کے فن کو سمجھنے میں کامیاب ہوا ہوں تو آپ کی حوصلہ افزائی کا منتظر رہوں گا۔

میری خواہش تو یہ بھی تھی کہ حیدر قریشی کی خاکہ نگاری کا بھی ایک مطالعہ اس کتاب میں شامل کرتا مگر میری کوتاہیوں نے اس کتاب کو مزید تاخیر کا شکار کر دینا تھا۔ اب اگر میں اپنے ایم فل کے مقالے کو جلد مکمل کر سکا تو میں حیدر قریشی کی دیگر تخلیقی جہات شاعری اور خاکہ نگاری کو بھی سمجھنے کی کوشش کروں گا۔ دراصل کوئی بھی تخلیقی فنکار اپنے پورے تخلیقی کام میں ہی اپنی ذات و نظریات کا مکمل اظہار کرتا ہے۔

حیدر قریشی کا نظریہ زندگی کیا ہے؟ اور کیا وہ اپنے نظریے کو اپنے تخلیقی اظہار کا شعوری لازمہ خیال کرتے ہیں؟ کیا کسی بھی نظریے کو تخلیق میں ضرور اظہار پانا چاہیے۔ چاہے وہ اس تخلیق کا تخلیقی حصہ بن بھی پائے یا نہ بنے؟ یہ سوال گنجلک بھی ہیں اور اختلافی بھی۔ البتہ افسانے کا بنیادی لازمہ کہانی ہے چاہے اس میں نظریہ موجود ہو یا نہ ہو۔ اگر فنکار کا زندگی کے بارے میں نظریہ یا نقطہ نظر اس کی تخلیق میں رچ بس کر آئے اور وہ اس کا تخلیقی حصہ معلوم ہو تو اس میں قباحت بھی کیا ہے۔ یقیناً اسے فوراً مقصدی ادب کہہ دیا جائے گا۔ ادب کا کسی نہ کسی سطح پر کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے کیونکہ ادب کا تعلق اپنے معاشرے سے قریبی نہ سہی 'عملی' ضرور ہے۔ ۶۰ء کے نئے لکھنے والوں نے مقصدی ادب میں کیڑے نکالنے کا کام کیا اور ایسا انہوں نے ترقی پسند تحریک کے رد عمل میں کیا۔ بات طویل ہوتی جا رہی ہے بنیادی مقصد یہی تھا کہ میں ان کہانیوں کو سمجھنے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ آپ پر ہے اور آپ کی حوصلہ افزائی اور رائے کا منتظر رہوں گا۔

کامران کاظمی

☆☆☆☆

کامران کاظمی

حیدر قریشی کے افسانوں کا مطالعہ

''کہانی کہنا ایک فطری
عمل ہے ---۔ کہانی کسی میز پر سنائی جائے یا
کسی جہاز کے دھواں دھار کمرے میں، وہ سننے
والے کو اپنی طرف کھینچتی ہے مگر اس حد تک
اختصار کے ساتھ جتنی اس کی ضرورت ہو'

سمرسٹ ماہم کی متعین کردہ افسانے کی یہ تعریف دراصل افسانے کی طوالت کے دائرہ کار کا تعین کرتی ہے۔ اور یہ ایک ایسا تعلق ہے کہ جس کا انحصار انسانی ذہن کی رسائی اور کہانی کی دلچسپی پر منحصر ہے۔ سمرسٹ ماہم کی اس بات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کہانی کے اختصار کا قائل ہے گویا اس کے خیال میں افسانہ کی طوالت وقت کے اعتبار سے دو گھنٹہ ہونی چاہیے۔ تاہم یہ طے کرنا باقی ہے کہ 'افسانہ' خود کیا ہوتا ہے۔ جبکہ کہانی کا عنصر تو ذرا قدیم عہد میں داستان کی صورت میں اور پھر ناول کی صورت میں بڑا بھرپور موجود تھا۔ گویا افسانہ، ناول سے کیونکر مختلف ہو سکتا ہے اس کی ایک عام وجہ تو افسانے کا اختصار ہے جبکہ ایک اور جامع نقطہ نظر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی یوں بیان کرتے ہیں:۔

''افسانے اور ناول کا
فرق طول و اختصار کا نہیں افسانہ نگار زندگی کی

بوقلمونی سے کسی ایک پہلو پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔''

اس سے یہ بات سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ ناول جو کہ پوری زندگی کا عکاس ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کا دائرہ کئی زندگیوں پر محیط ہوتا ہے البتہ افسانے کا وصف یہی ہے کہ وہ بکھری پڑی زندگی کے کسی ایک جزو کا اظہار کرتا ہے۔

سید وقار عظیم مغربی اور مشرقی اکابرین ادب کی آراء کو زیر بحث لانے کے بعد افسانے کی اجزائے ترکیبی میں تین درج ذیل عناصر کو بنیادی قرار دیتے ہیں۔

پلاٹ ، کردار اور فضا۔

اور انھیں تین عناصر پر اہل نقد متفق بھی دکھائی دیتے ہیں۔

اردو افسانے کو اپنی ابتدا میں ہی اپنی ہیئت، ساخت اور فنی اظہار کے لیے اہم نام مل گئے۔ مثلاً پریم چند نے اردو افسانے کی نہ صرف فنی اعتبار سے صنف کا تعین کیا بلکہ زندگی سے موضوعات اخذ کر کے فکر کے میدان میں اسے آغاز ہی سے زندگی کے قریب کر دیا۔ اس طرح اردو افسانہ کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو کے ہاں نہ صرف یہ کہ وسیع موضوعات سے روشناس ہوتا ہے بلکہ اس میں اسلوب کی سطح پر بھی کئی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ اور ان تبدیلیوں کے محرک یقیناً اس عہد کی معروف ترقی پسند مصنفین کی تحریک بھی ہے۔ ترقی پسندوں نے ادب میں مقصدیت کا علم اٹھایا تو ساتھ ہی ان کی مخالف سمت میں ادب برائے ادب کا غلغلہ بلند ہوا۔ البتہ اردو افسانہ ان دونوں تحریکوں یا روؤں سے برابر فیضیاب ہوتا رہا اور نئے موضوعات و اسالیب کو اپناتا رہا۔

یہاں مراد اردو افسانہ کی تاریخ کی درجہ بندی نہیں ہے بلکہ مختصر تعارف مقصود تھا اور قدرے ان حالات کی نشاندہی بھی کہ جن میں حیدر قریشی بطور افسانہ نگار اپنی شناخت بناتے ہیں۔

اردو افسانہ تقسیم برصغیر کے بعد جہاں نئی زمین کی بازیافت کا مرحلہ طے کرتا ہے وہاں فسادات کو بھی موضوع بناتا ہے۔ اور پھر جلد ہی خواب ٹوٹنے سے ایک نوحہ کی سی کیفیت نظر آنے لگتی ہے اور ملامت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس عہد کے افسانے کے مطالعہ سے یہ گمان ہوتا ہے کہ تقسیم کا عمل درست نہ تھا۔ تقسیم کا عمل ایک نظریے کے سبب عمل میں آئی جبکہ انسان بذات خود

نظریوں سے بڑا ہوتا ہے۔ یہ علیحدہ بحث ہے کہ وہ پھر نظریے کی خاطر کیوں کٹ مرتا ہے۔

فسادات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے موضوعات میں جب یکسانیت در آنے لگی تو افسانے نے اسلوب کی سطح پر نئی کروٹ لی اور اس اسلوبیاتی تبدیلی نے اس کے موضوعات بھی تنوع عطا کیا۔

پاکستان بننے کے بعد جلد ہی فوجی تسلط قائم ہو گیا اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے چینی کو افسانے میں تبدیلی کا نمایاں مظہر سمجھتے ہوئے ڈاکٹر اعجاز راہی لکھتے ہیں:۔

''۔۔۔۔۔۔درمیان
سے اسے (افسانے کو) مارشل لاء نے اچک لیا
چنانچہ زمانہ ایک ڈگ بھر کر عصری مبادیات میں
محسوس تبدیلیوں کا اعلان نامہ بن گیا اور جذبات
،احساسات اور زندگی کے تجربے، نئے عصر میں
سانس لینے لگے۔ تب افسانے نے فکری سطح پر
اور اسلوبیاتی سطح پر ایک ساتھ موڑ کاٹا اور نئی
زندگی اور زندگی کے نئے سانچے ٹوٹ گئے۔
نئے رویوں میں نیا انداز غالب آ گیا۔''

جدید افسانے نے خارج سے باطن اور باطن سے خارج کے سفر میں زندگی کی نئی جہات کو تلاش کیا۔ اسلوبیاتی سطح پر پیدا ہونے والا ارتعاش دراصل علامتی افسانے کی تحریک کا پیش خیمہ بنا جو ۶۰ء کی دہائی میں زیادہ زور شور سے اٹھی۔ تاہم اس کے ڈانڈے گذشتہ دہائی کے افسانے میں بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً منٹو کا افسانہ 'پھندنے' اور اس سے بھی ذرا پہلے احمد علی اور کرشن چندر کے ہاں علامت، تجرید اور رمزیت کا پہلو نظر آتا ہے۔

ساٹھ کے لکھنے والوں میں انور سجاد نے باقاعدہ تجریدی علامتی اسلوب کو اپنایا۔ پھر ان کے ساتھ خالدہ حسین، رشید امجد، احمد ہمیش، سمیع آہوجہ اور اعجاز راہی وغیرہ بھی شامل ہو گئے۔ ۷۰

کی دہائی تک آتے آتے اس فہرست میں چند مزید ناموں کا اضافہ ہو گیا۔ جن میں شمس نغمان، نجم الحسن رضوی، احمد جاوید، احمد داؤد، حیدر قریشی اور بہت سے دوسرے افسانہ نگار شامل ہیں۔

افسانہ نگاروں کی یہ نسل ان افراد پر مشتمل ہے جنھوں نے تقسیم کا منظر تو شاید شعور کی عمر میں نہیں دیکھا البتہ پاکستان کے دگرگوں حالات کا مشاہدہ بڑی باریک بینی سے کیا۔

۶۰ء کے عشرے میں جنم لینے والی ''نئے افسانے'' کی تحریک سے نیا افسانہ جوں جوں مقبول ہوتا گیا اس میں اس میں اسلوب سازی کے نئے تجربات میں بھی اضافہ ہونے لگا اور بیشتر افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے انداز میں زبان کا ایک نیا نظام وضع کرنے کی کوشش کی۔ شاعری میں اسی عہد میں نئی لسانی تشکیلات کا شور بپا تھا مگر افسانے کی زبان شروع سے ہی سادہ تھی البتہ اس میں علامتی بیانیہ کا عنصر بعد ازاں غالب آ گیا۔ اس دور میں اسلوب سازی میں علامت، تجرید اور تمثیل کے استعمال کے علاوہ منظر کشی، فضا بندی اور ماحول سازی سے بھی کام لیا گیا۔ یہ امر واضح ہے کہ ہر لکھنے والے کا اسلوب اپنا ہوتا ہے گو کہ نئے لکھنے والوں میں نمایاں فرق اسلوب کی سطح پر نمودار ہوا۔

گذشتہ افسانے میں خارج سے باطن اور باطن سے خارج کی تلاش کا رجحان غالب تھا جبکہ جدید افسانے میں باطن کو ہی کھوجنے کا عنصر زیادہ نمایاں ہوا۔ باطن کی تلاش اور خارج سے کٹ کر جینے کی روائیت اردو ادب میں صوفی ازم سے جڑی ہوئی ہے۔ گیان دھیان میں گم صوفی جہاں خارجی علائق سے متعلق نہیں ہوتا وہاں اپنے اندر کہیں گم ہوتا ہے۔ جبکہ باطن کی کھوج مذہبی تجربے سے جڑی ہوتی ہے اور وحدانیت کا مذہبی تجربہ اس کے لیے زیادہ سود مند ہوتا ہے کیونکہ کثرت خدا کے تجربہ میں بعض اوقات خدا ٹھوس شکل میں خارجی سطح پر موجود ہوتا ہے جبکہ وحدانی تجربہ میں خدا جتنا خارجی مظاہر میں نمود پذیر ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ باطن کی گہرائیوں میں اپنا جلوہ دکھا رہا ہوتا ہے۔

۶۰ء اور ۷۰ء کے عشرے میں جہاں دیگر افسانہ نگار خارجی حقائق سے دلبرداشتہ ہو کر باطنی تجربہ کو کہانی میں وقوعہ بنا رہے تھے وہاں حیدر قریشی خارج سے کٹ کر گیان دھیان کے فلسفے کو

عمل میں لا کر کہانی کی نئی جہت کی تلاش میں مگن تھا۔

حیدر قریشی کا بنیادی فلسفہ 'ہمہ اوست' ہے۔ وہ کائنات اور دیگر تمام مظاہر کو ایک بڑے نامیاتی کل کا جزو مانتے ہیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ میں نے 'جزو' کہا ہے عموماً وحدۃ الوجود کی تعریف کرتے ہوئے بعض دانشور 'ایک بڑے کل کے حصے' خیال کرتے ہیں۔ 'حصہ' ہونے سے وجود کی وحدانیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ جبکہ 'جزو' اس کل کا ایسا حصہ ہوتا ہے جو دوبارہ اپنی جگہ پر قائم ہو سکتا ہے۔

حیدر قریشی کا نظریہ حیات یہ ہے کہ کائنات ایک 'کل' کی حیثیت سے وجود رکھتی ہے گویا وہ تمام اشیاء میں وحدت کی کارفرمائی کو بنیادی عنصر خیال کرتے ہیں۔

وحدۃ الوجود کا یہ تصور ہند سے فارس اور فارس سے اسلام کا حصہ بنا ہو یا صوفیا کے باطنی تجربہ کی اختراع ہو یہ امر طے شدہ ہے کہ اس نے حیات انسانی پر متنوع اثرات مرتب کیے ہیں۔

برصغیر کے زرعی سماج میں داستان کا رواج عام ہوا تو اس میں بھی اسی صوفیانہ تجربہ کی کارفرمائی زیادہ دکھائی دی۔ 'ہمہ اوست' کا نظریہ داستانی ادب کا حصہ تو تھا ہی اس نے اردو شاعری پر بھی اپنے دیرپا اثرات چھوڑے آج کے جدید شعرا کے ہاں بھی یہ نظریہ اہم نظریاتی سطح تک پایا جاتا ہے۔ جبکہ حیدر قریشی کے ہاں اس نظریہ کے سبب سے داستانی عنصر نمایاں ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے اسلوب میں داستانی عناصر زیادہ ہونے کی وجہ سے نظریہ ہمہ اوست در آیا ہو۔ محسوس ہوتا ہے کہ دوسری بات ہی زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ داستانی طرز بیان ان کی کہانیوں کا خاص وصف ہے۔

مثلاً اس مجموعے کی دوسری کہانی ''گلاب شہزادے کی کہانی'' گو کہ جدید عہد اور اس کی منافقتوں یا ضروریات زندگی کی تلاش اور زیادہ سے زیادہ اشیا کو اپنے تصرف میں لانے کی جدوجہد کے نتیجے میں پیدا شدہ منافقتوں کا اظہار کرتی ہے مگر اپنے داستانوی رنگ اور بیان کے حوالے سے کسی قدیم منظر نامہ کا حصہ لگتی ہے۔

۶۰ اور ۷۰ء کی دہائی میں جب ابلاغ اور اظہار پر مختلف سطح کی پابندیاں عائد تھیں اور

فنکار کے مسدود ہو کر رہ گئے تھے تو انھوں نے تخلیقی اظہار کی نئی راہیں تلاش کیں اور یہ تلاش جہاں جملہ سازی اور کہانی میں تجرید کی سطح پر لے گئی وہیں وقوعہ کا اظہار بھی اسی تجربہ میں ہونے لگا۔

حیدر قریشی کا نمایاں وصف مذہبی اساطیر کو کہانی کا حصہ بنا کر ان کے ذریعے سے سماجی مسائل کا اظہار ہے۔ ان کی کہانیوں کا داستانوی رنگ تقاضا کرتا ہے کہ موضوعاتی سطح پر ایک ایسا تلمیحاتی و استعاراتی نظام وضع کیا جائے جو انسان کے لیے نہ صرف یہ کہ تاریخی حیثیت کا حامل ہو بلکہ عصر حاضر میں اس کی اہم ضرورت بھی ہو۔ مذہب کسی معاشرت کا فعال حصہ ہوتا ہے۔ گو کہ ابھی تک یہ طے نہیں ہوسکا کہ ثقافت مذہب کے بطن سے پھوٹتی ہے یا مذہب مقامی ثقافت میں ڈھل جاتا ہے۔

''ایک کافر کہانی'' اور ''حوا کی تلاش'' میں مکمل مذہبی استعارات و تلمیحات کا استعمال ہے۔ ''ایک کافر کہانی'' دراصل وحدۃ الوجودی فلسفے کی مکمل عکاس ہے کہ کہانی کار مذہبی تجربے کو کسی خارجی مظہر کے طور پر نہیں لیتے بلکہ اسے تہذیبی ضرورت سمجھتے ہیں اور اسے معاشرتی مسائل کے سدباب کا واحد ذریعہ بھی خیال کرتے ہیں۔ یہ کہانی دراصل صوفیانہ تجربے سے گذرنے والے شخص کی کہانی ہے البتہ موضوعاتی سطح پر یہ کہانی اپنی دلچسپی آخر تک برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس کہانی کا بنیادی موضوع انسان کی اہمیت کا ہونا ہے۔ کہ کائنات میں سب سے اہم انسان ہے اگر اس نے خود کو شناخت کر لیا ہے تو کعبہ اس کے استقبال کو خود چل کر آئے گا۔☆ اور جو اپنے وجود کی شناخت ظاہر اور خارج سے چاہتا ہے وہ چاہے زمین پر قدم قدم پر سجدے کرتا جائے اسے وہ مقام نہیں مل سکتا۔ خدا تک پہنچنے کے سفر میں صوفی جب باطنی تجربے سے گذرتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ جہاں تک پہنچنے کی تگ و دو کر رہا ہے وہ اس کے اندر ہی ہے۔

''عرش کیا ہے؟
فرمایا ''میں ہوں''
''لوح و قلم کیا ہے''
فرمایا ''میں ہوں''۔۔۔

- - - -

تب فرمایا
''جو شخص حق میں محو
ہوجاتا ہے اور جو کچھ حق ہے اگر ایسی صورت میں
وہ سب کچھ ہوتو کوئی تعجب نہیں ۔''
(ایک کافر کہانی)

اسی طرح اس کہانی میں ایک اور جگہ پر جب صوفی کو عرفان ذات ہوجاتا ہے اور وہ مستانہ وار رقص میں محو ہوجاتا ہے تو کہتا ہے

''میں خدائے وقت ہوں
مصطفائے وقت ہوں ۔''
(ایک کافر کہانی)

البتہ بعض افراد کی عقل ان حقائق کی رسائی نہیں کرسکتی یا پھر تعصب کی کارفرمائی ہوتی ہے مگر افسانہ نگار کا تجزیہ بالآخر منصور حلاج کا تجربہ بن جاتا ہے۔ جبکہ صوفی کے لیے فنافی اللہ کا مقام ہوتا ہے۔ جہاں وہ اور اس جیسے دیگر صوفی ایک ہی کفن میں زندگی بسر کررہے ہوتے ہیں۔ کفن میں زندگی بسر کرنا سے یہاں مراد یہ ہے کہ وحدۃ الوجودی صوفی اس ظاہری دنیا کو قبر اور خدا سے وصال کو ہی اپنی زندگی سمجھتا ہے۔ کفن یہاں پاکیزگی اور حقیقت تک رسائی کی علامت ہے۔ سفید کفن بے داغ کردار کی علامت بنتا ہے اور ایک ہی کفن میں سب کا ہونا ہی دراصل وصال ہے۔

حیدرقریشی ماضی کے واقعہ کو نئے عہد کا اظہار یہ بنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔
''گلاب شہزادے کی کہانی'' تجریدی واستعاراتی کہانی ہے مگر اس کا تعلق اس موجودہ عہد سے ہے اور ساتھ ساتھ یہ کہانی ماضی کی بازیافت بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس کہانی میں شہزادے جاہ وجلال

کے حصول کی خاطر اپنے ہی بھائیوں کا خون کردیتے ہیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ زیردستوں پر ہمیشہ زبردست حکمرانی کرتے ہیں۔ اور حکم عدولی کا مطلب موت ہوتا ہے یہ افسانہ ''قصہ چہار درویش'' کی یاد تازہ کرتا ہے اس کہانی کا تانا بانا چار درویشوں ہی کے گرد بنا گیا ہے پہلے درویش کا کردار کہانی کے مکمل ہونے پر عیاں ہوتا ہے کہ وہ خود غرض تھا اور مال و دولت کا حریص بھی۔ جو باقی درویشوں کو ان کے ماضی کی بازیافت سے احساس گناہ میں مبتلا کردیتا ہے اور وہ حقیقت کی تلخی سے آشنا ہوتے ہی موت قبول کرلیتے ہیں۔ گلاب کا پھول یوں تو حسن کی علامت ہے مگر اس افسانے میں اسکی معنویت بطور تلخ سچائی کے سامنے آتی ہے۔

دوسرا درویش اپنی بیوی کی خوبصورتی اور جنسی کشش کا گرویدہ ہوکر اس کا غلام بن جاتا ہے گویا ایک عورت اپنی خوبصورتی سے ایک مرد کو گدھا بنادیتی ہے اس درویش کی کہانی اس المیے کا عملی اظہار ہے۔ یوں پھر ایک دن کوئی اسم اس کے ہاتھ آتا ہے اور جس خوبصورت عورت نے درویش کو گدھا بنایا ہوتا ہے وہ اسے گھوڑی بنادیتا ہے گھوڑی جنسی علامت ہے وہ اسم کیا ہے؟ جس سے یہ کایاکلپ ہوجاتی ہے۔ کہانی کا منظرنامہ دیکھنے سے یہ پتا چلتا ہے وہ اسم اس خوبصورت عورت کی جنسی کشش ہے جسے درویش استعمال کرتا ہے وہ خود کہتا ہے:۔

''پھر ۔ ۔ ۔ جب
میری بیوی اپنی پہلی تنخواہ لائی تھی تو اس کا چہرہ
خوشی سے گلنار ہورہا تھا۔ اس نے اپنی آدھی تنخواہ
گھر کے اخراجات میں ڈال دی اور بقیہ آدھی
بچوں کے مستقبل کے لیے بنک میں جمع کرادی''

یوں اب غیر محسوس طور پر درویش کا کردار بدل جاتا ہے اور وہ گدھے سے گھوڑی کا مالشیا بن جاتا ہے اس کی ٹہل سیوا کرتا ہے۔ اور سواری کے شوقین افراد کو پیش کرتا ہے گویا خوبصورتی کا ایک ہی معنی افسانہ نگار دکھاتا ہے کہ وہ یعنی حسن طوائف ہے۔ دراصل یہ سماج کا رویہ ہے جسے افسانہ نگار من وعن دکھا رہا ہے کہ عورت خود بھی محض جنسی آسودگی کا ذریعہ بننے کے اپنے لیے اور کوئی

کردار بسا اوقات پسند نہیں کرتی ۔البتہ جب درویش کو سچ کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ گدھا تو اس صورت میں بھی بنا رہا ہے تو اسے موت کا تحیر آن گھیرتا ہے ۔تیسرا درویش جو خاندانی منصوبہ بندی کا حامی ہے اور اپنے پیشے کے مطابق انسانی کھوپڑیوں کا معائنہ کرتا ہے تو دوبارہ زندگی کی مثبت اقدار کی طرف لوٹتا ہے اور ایک بچے کی خواہش اسکے دل میں مچلتی ہے اور وہ ضد کر کے اپنی بیوی کو بھی ایک بچہ پیدا کرنے پر آمادہ کر لیتا ہے ۔البتہ اس کی موت کا سبب کیا ہے؟ کہانی کار واضح اشارہ نہیں دیتا ممکن ہے وہ جو پہلے کنڈوم استعمال کرتا تھا ان کی وجہ سے اب جنسی طور پر اس قابل نہ رہا ہو کہ بچہ پیدا کر سکے اور نئے پیدا ہونے والے بچے کو اپنانا اس کے لیے ممکن نہ رہا ہو۔ گویا اس کی موت کا بھی بنیادی سبب سچ کا سامنا ہے ۔البتہ کہانی کے پردوں میں مستور ایک حقیقت اور بھی ہے اور اس کا سامنا ہمیں چوتھے درویش کی کہانی کے بعد ہوتا ہے ۔پہلے دونوں درویشوں کا انجام دیکھ کر وہ چوکنا ہو جاتا ہے ۔چوتھا درویش دراصل پہلے درویش کا بھائی بند ہی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا مقصد دولت کا حصول ہے ۔چوتھا درویش دولت تو حاصل کر لیتا ہے مگر اس کی بڑی بھاری قیمت چکاتا ہے ۔کہ اپنے سگے بھائی کو قتل کر دیتا ہے ۔یوں وہ بھی سچ کا سامنا کرتے ہوئے موت کا شکار ہو جاتا ہے ۔

''گلاب شہزادے کی کہانی اس لیے بھی ایک تفصیلی جائزے کی متقاضی تھی کہ یہ کہانی حیدر قریشی کی نمائندہ کہانیوں میں سے ہے ۔اور ان کے فنی اسلوب کا مکمل اظہار بھی اسی کہانی میں ملتا ہے ۔کہانی کا انداز داستانی ہے اور روائتی شہزادوں کی طرح کا ہی منظر نامہ بھی ہے ۔ پہلے درویش کی مکاری (لفظ ’مکاری‘ افسانہ نگار پہلے درویش کے لیے صرف ایک بار استعمال کرتا ہے) باقی درویشوں کی موت کا باعث بنتی ہے ۔کہانی کا بنیادی استعارہ ’گلاب کی قلم‘ ہے گلاب جہاں حسن کی علامت ہے وہیں جوش، ولولہ اور محبت کی گرمجوشی کا استعارہ بھی ہے ۔ جسے کام میں لا کر افسانہ نگار پہلے درویش کا کردار بنتا ہے ۔ پانی پینے کے بعد موت مرنا بظاہر پانی کی جگہ زہر کا استعمال لگتا ہے ۔ممکن ہے ایسا ہو مگر کہانی کی کوئی علامت ایسا سمجھنے میں مدد نہیں دیتی ۔دراصل پانی موت کا عمل آسان کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے ۔اور پھر پہلے درویش کی موت کہ جب

وہ سارے صحرا کا جو کہ معدنیات سے بھرا پڑا ہے، مالک و مختار بن جاتا ہے دراصل مکافاتِ عمل ہے ۔اور یوں افسانہ نگار کا روائتی داستانی انداز اور اپنے پورے اسلوب کے ساتھ تکمیل کو پہنچتا ہے ۔اور کہانی بھی اپنے منطقی انجام تک پہنچ جاتی ہے کہ جہاں ''شر'' کی قوتوں کو نابود ہو جانا ہوتا ہے ۔

یہ کہانی یا اس طرح کی دیگر کہانیاں اپنے جلو میں ایک مکمل تاریخی حقیقت بھی لے کر چلتی ہیں ۔جیسا کہ ڈاکٹر قمر رئیس حیدر قریشی کی کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''یہ کہانیاں علامتی ہیں
لیکن معاصر کہانیوں سے الگ اور انوکھی ہیں ۔
یہاں تاریخ گنگناتی ہے انسانی تہذیب
سرگوشیاں کرتی ہے اور ان کی کوکھ سے آج کے
جلتے ہوئے مسائل پھنکارتے ہوئے نکلتے
ہیں۔'' (ڈاکٹر قمر رئیس ۔تاثرات مطبوعہ مجموعہ
’افسانے‘ از حیدر قریشی)

حیدر قریشی کی کہانیوں کی بنیادی الجھن حب جاہ ہے اور وہ نہ صرف اس پر طنز کرتے ہیں بلکہ اس کے نتائج سے باخبر بھی کرتے جاتے ہیں ۔مثلاً ''گلاب شہزادے کی کہانی'' کا پہلا درویش جس دولت کے حصول اور اس پر تنہا ملکیت کا دعویٰ رکھنے میں باقی درویشوں کی جان سے کھیل جاتا ہے وہ اسی دولت کے کنویں میں گر کر مر جاتا ہے ۔ اسی طرح ''بے ترتیب زندگی کے چند ادھورے صفحے'' بھی ایسا افسانہ ہے کہ افسانے کا دولت مند کردار بالآخر اپنے منطقی انجام تک پہنچ جاتا ہے اور حق اپنے حقدار کو مل جاتا ہے ۔اس کہانی میں پانی کے ایک قطرہ کی مثال کے ساتھ جبر اور اختیار کے مسئلے کو بھی نئے پیرائے میں ظاہر کیا گیا ہے ۔

حیدر قریشی نے اپنی کہانیوں کا خمیر اسی معاشرے کی سماجی زندگی سے اٹھایا ہے اور اپنی معاشرت کی بھرپور عکاسی کی ہے ۔انھوں نے کہانی کا خمیر ایسے سلگتے مسائل سے اٹھایا ہے کہ جنھیں کوئی اچھا خاصا فنکار بھی بمشکل ہی نبھا سکے ۔دراصل اس طرح کے موضوعات کو کہانی کا حصہ بنانا

کوئی مشکل امر نہیں ہے بلکہ ان موضوعات کو بجائے خود کہانی بنانا بہر حال مشکل کام تھا۔مثلاً ''غریب بادشاہ'' ایک یک جہتی موضوع تھا۔اور مزید مشکل یہ بھی تھی کہ کہانی کے کرداروں کے مابین خشک اقتصادی نظریات پر بحث ہوتی ہے اور بظاہر تاریخ بھی کرداروں کی گفتگو کا موضوع ہے جبکہ افسانے میں کہانی کا موضوع بھی روایتی ہے کہ ایک لڑکا اپنے فطری تقاضوں سے مغلوب ہو کر اپنے جیسی جوان لڑکی سے محبت کرتا ہے تاہم لڑکی کے دل و دماغ میں ایسی محبت کا کوئی اکھوا نہیں پھوٹتا بلکہ وہ محبت تو اس لڑکے سے کرتی ہے مگر اس محبت میں جذبات بالکل مختلف ہیں۔حیدر قریشی نے اس روائتی کہانی کو غیر روائتی انداز میں آگے بڑھایا ہے اور جب وہ لڑکی اس لڑکے کو راکھی باندھتی ہے تو ایک دم سے بیان ہو چکی ساری کہانی اپنی بازیافت کراتی ہے اس آخری مرحلے پر کہانی میں کہانی کا حصہ بنتی ہوئی اقتصادی، تاریخی اور ثقافتی بحثیں قاری کو ایک نئے ذائقے سے روشناس کراتی ہیں۔اور وہ ذائقہ ایک ایسی اذیت ناکی کا ہے جسے کوئی بیان تو نہیں کر سکتا البتہ کبھی کبھار اس پر ایک دکھ بھرا قہقہہ لگا دیتا ہے۔اس کہانی میں جہاں جدید اقتصادی مباحث کو زیر بحث لایا گیا ہے وہیں قدیم اساطیر کی بھی جھلک نظر آتی ہے اور اساطیری موضوعات کے ذریعے کہانی کہنا حیدر قریشی کا اسلوبیاتی سطح پر بہت عمدہ وصف ہے۔ایسی ہی رائے ڈاکٹر فہیم اعظمی ''روشنی کی بشارت'' پر تبصرہ کرتے ہوئے دیتے ہیں۔ان کا کہنا ہے:۔

''حیدر قریشی الہامی
قصص، اساطیر، ذاتی اور معاشرتی مسائل کو آپس
میں مدغم کر کے ایک ایسا آئینہ تخلیق کرتے ہیں
جس میں پیدائش سے موت تک زندگی کا عکس نظر
آتا ہے۔'' (ڈاکٹر فہیم اعظمی تاثرات
مطبوعہ کتاب ''افسانے'' از: حیدر قریشی)

اساطیری یا مذہبی تلمیحاتی کرداروں سے کہانی کی تشکیل اور آج کا سچ کہانی کے کرداروں کے مکالموں سے بیان کرانا ان کا خاص وصف ہے۔وہ تاریخ سے، زمینی تمدن اور

ثقافت سے بڑی خوبصورتی سے کہانی کو سجاتے ہیں اور اپنے عصر کے مسائل کا اظہار بڑی فنی چابکدستی سے کرتے ہیں۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی ان کہانیوں کے اسی اساطیری پہلو پر تبصرہ کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں کہ:۔

''حیدر قریشی فلسفیانہ، مذہبی اور اخلاقی قدروں پر بھی رائے دیتے ہیں تو کسی غیر متعلق یا خارجی خیال آرائی کا احساس نہیں ہوتا اور سب کچھ کہانی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔''

(ڈاکٹر فہیم اعظمی تاثرات مطبوعہ کتاب ''افسانے'' از حیدر قریشی)

حیدر قریشی کے ہاں سماجی جبر اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی گھٹن اور اس گھٹن سے جنم لینے والے خوف کا اظہار المیہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ان کے افسانوں میں طنز کی کاٹ گہری ہے۔البتہ کرداروں کو عدم تحفظ کا خوف زندگی کی گہما گہمی سے قدرے دور کر دیتا ہے۔دراصل اس دوری کو حیدر قریشی زندگی کی آلائشوں سے دوری کے طور پر لیتے ہیں۔اور جلد ہی خارج سے ان سہم کر آئے کرداروں کے باطن میں روشنی کی ایک نئی کرن جگمگا دیتے ہیں اور انھیں زندگی کے ایک نئے جادے کے ہمراہ کر دیتے ہیں۔

دیوندر اسر اپنے مضمون میں حیدر قریشی کی کہانیوں پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

''حیدر قریشی کی کہانیاں
ایک نئی تخلیقی روائیت کی شروعات ہیں جو واقعاتی
تسلسل اور کہانی پن پر مبنی ہو کر سوال، شک اور فکر
کی بنیاد پر کہانی کا شفاف شیشہ گھر تعمیر کرتی ہیں
۔اس شیشہ گھر میں ہم داخل ہونے کے لیے
آزاد ہیں۔لیکن اس سے باہر نکلنے کے راستے بند
ہیں۔صرف ایک چھوٹا سا روشن دان کھلا ہے
ہمارے دل کا۔۔۔جس کے ساتھ ساتھ چل کر
ہم وقت کے اس نقطہ پر پہنچتے ہیں جہاں سچ ہمارا

منتظر ہے۔ جہاں سچ سے ہم معانقہ کرتے ہیں''

(دیوندر اسر۔''روشنی کے شیشہ گھر میں''مطبوعہ ماہنامہ ادب لطیف لاہور)

انسان دوستی کا پرچار اور انسان کو درپیش ایٹمی ہلاکتوں کا خوف، سماجی طبقاتی ناہمواری اور انسانوں کی انسانوں کے ہاتھوں بے توقیری، منافقت، جھوٹ اور انسانی تعلقات کی ٹوٹ پھوٹ جیسے بے شمار موضوعات ان کے افسانوں کا حصہ ہیں۔

حیدرقریشی کا نمایاں وصف یہ ہے کہ ان کی تمام کہانیاں جہاں اپنی الگ الگ شناخت کراتی ہیں وہاں ان میں ایک ایسی وحدت بھی موجود ہے جو ایک نظریاتی اکائی بھی تشکیل دیتی ہے۔ مذہب کی من مانی یا غلط تعبیر کے نتیجے میں پیدا تنگ نظری سے اوپر اٹھ کر صوفیا کی پھیلائی ہوئی انسان دوستی کا نظریہ ہی وہ اکائی ہے جو ان افسانوں میں سے جھلکتی ہے۔ حیدرقریشی اس انسان دوستی کو انسان کے تمام سماجی اور طبقاتی مسائل کا حل گردانتے ہیں۔ جہاں ''تو'' اور ''میں'' کی شناخت ختم ہو جائے اور انسان ''ہم'' کے شعور سے آشنا ہو جائے۔

دیوندر اسر اس انسان دوستی کے رویے کی نشاندہی ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

''۔۔۔۔راستہ ہم جو
بھی اپنائیں، گیان کا دھیان کا بھگتی کا۔۔۔۔
حیدرقریشی کی کہانیاں ان مختلف راستوں سے
گذرتی ہیں اور انجام کار اس نقطہ پر پہنچتی ہیں
جہاں تمام ثقافتیں، تمام انسان ایک ہو جاتے
ہیں۔''(دیوندر اسر۔''روشنی کے شیشہ گھر میں''
مطبوعہ ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' لاہور)

بہتر ہوگا کہ حیدرقریشی کی کہانیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے موضوعاتی حوالے کے ساتھ ساتھ ان کی کہانیوں کی فنی نزاکتوں کو بھی پرکھ لیا جائے۔ کہ کسی بھی تخلیق کار کا اسلوب اسکی اپنے فن پر گرفت سے ہی متعین ہوتا ہے۔

فنی اعتبار سے اس مجموعے کی اکثر کہانیاں سادہ بیانیہ انداز میں لکھی گئی ہیں۔ علامتی اسلوب اس بیانیہ کو نشیب جاتی ندی کی مانند تیز کر دیتا ہے۔ استعاروں کا استعمال خوبصورت ہے۔ فنی اعتبار سے وہ ایسا استعارہ یا تلازمہ نہیں برتتے جو قاری کے لیے الجھن کا باعث بنے۔ گو کہ وہ استعارہ اپنے اندر معانی کی کئی جہات لیے ہوتا ہے۔ اسی طرح علامت بناتے وقت جہاں وہ تاریخی واقعات کا سہارا لیتے ہیں وہیں جدید عہد کی مشینی زندگی بھی ان کے ہاں علامت کا روپ دھار لیتی ہے۔

زبان کا استعمال حیدرقریشی کی کہانیوں میں سادہ، رواں، اور مترنم ہے۔ بعض اوقات مکالمہ نثری نظم کا سا ذائقہ دے جاتا ہے۔ البتہ وہ زبان کے استعمال میں کوئی تجربہ نہیں کرتے۔ اس کی بنیادی وجہ ان کے اسلوب میں تاریخی اور اساطیری موضوعات کا کثرت سے ہونا بھی ہو سکتی ہے۔ چونکہ زبان مسلسل ارتقا پذیر عمل ہے اور ہر آن اس میں تغیر اور تحرک کی صورتیں بنتی بگڑتی رہتی ہیں مگر جب کوئی بھی زبان اپنے بنیادی ڈھانچے طے کر لیتی ہے اور ایسا متواتر تاریخی عمل میں ممکن ہوتا ہے تو اس زبان میں ارتقا کا عمل سست پڑ جاتا ہے یا وہ غیر محسوس انداز میں اثر انداز ہو رہا ہوتا ہے۔ ممکن ہے حیدرقریشی اب اس ارتقا کے عمل کو تکمیل کی صورت میں دیکھ رہے ہوں۔ اور ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ کہانی کی زبان میں کوئی نیا تجربہ کرتے دکھائی نہیں دیتے۔ ایک اور اہم کوشش جس میں ان کے شعور کا دخل زیادہ دکھائی دیتا ہے وہ یہ ہے کہ حیدرقریشی نئی رائج ہونے والی لفظیات کو اپنے تاریخی ورثہ میں موجود لفظیات پر ترجیح نہیں دیتے۔ اس کی کئی مثالیں ان کی کہانیوں میں جابجا مل جاتی ہیں مگر اس کی سب سے عمدہ مثال افسانہ ''حوا کی تلاش'' میں ایٹم بم کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے لفظ ''ایٹم'' اور ''حطم'' جیسے الفاظ کی ہے ایسی اور بھی کئی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔

حیدرقریشی کے اسلوب میں کہیں کھردراپن محسوس نہیں ہوتا یعنی کہانی رواں دواں کہتے ہیں۔ اور اسکی منطقی ترتیب کو بدل کر یا واقعات کی سچائی کی غیر حقیقی انداز میں پیش کش سے قاری کو چونکا دینے کا غیر تخلیقی رویہ اختیار نہیں کرتے۔ گو کہ افسانہ ''غریب بادشاہ'' میں ایسا رویہ محسوس ہوتا

ہے کہ افسانہ نگار کہانی کے اختتام پر ایک دم اسے ایک نیا موڑ دے دیتا ہے دراصل یہ کہانی کی موضوعی ضرورت تھی کہ آخر میں کسی چونکا دینے والے وقعہ پر اس کا اختتام کیا جاتا۔ تاہم اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو کہانی کار سارے واقعے میں ایسے نشانات دیتا جاتا ہے کہ جو اس کہانی کے اپنے منطقی انجام سے لگا کھاتے ہیں۔ البتہ قاری کو ایسا اس لئے محسوس ہوتا ہے کہ وہ کرداروں کے دلچسپ مکالموں میں اس قدر منہمک رہتا ہے کہ اسے کہانی کے انجام کی خواہش ہی نہیں رہتی۔ سو وہ تب چونکتا ہے جب کہانی ایک بند گلی کا موڑ کاٹتی ہے اور قاری واقعات کی منطقی ترتیب کی طرف پھر سے لوٹتا ہے۔ ایک اور بات یہ بھی اہم ہے کہ اس کہانی کے کرداروں کے ساتھ بھی ایک مخصوص نفسیاتی عارضہ ہے کہ اس کہانی کا ہیرو یا مرکزی کردار محبت کے صرف ایک رخ سے آگاہ ہے اور جب اس پر دوسرا رخ آشکار ہوتا ہے تو وہ خود کو ایک دم سے بند گلی میں پاتا ہے۔ اور محبت کے ایسے معنوں کا شکار ہونے سے جن کی وہ توقع نہیں کر رہا تھا چونکنے کا عمل جنم لیتا ہے اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کہ قاری اور کہانی کا مرکزی کردار فطری محبت کے اس سارے عمل میں خود کو **ناکام** سمجھتے ہوئے غم کے ناگہانی جذبے سے دوچار نہیں ہونا چاہتے۔

حیدر قریشی کے افسانوں میں ان کا ایک نمایاں وصف قرآنی آیات کے استعمال کا سلیقہ ہے۔ وہ آیات کا استعمال برمحل اور پر اثر انداز میں کرتے ہیں۔ البتہ وہ اپنے فکری ماخذ کے طور پر قرآن اور اسلام کو ضابطہ حیات تسلیم کرنے کے باوجود تاریخی اعتبار سے اسی زمین سے جڑے ہوئے ہیں۔ یعنی وہ مذہب کے روحانی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ زمینی تمدن کو بھی انسانی حیات کی بقا اور ترقی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

''قدیم کلچر آج بھی کسی نہ کسی روپ میں ہمارے ساتھ ہے۔ جذباتی نعرے بازی کر کے اس سے فرار حاصل نہیں ہوسکتا۔ ہماری پیدائش سے لے کر شادی، بیاہ اور مرگ تک کی رسومات پر قدیم ہندوستانی کلچر کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ کھرچنے سے بھی ختم نہ ہو۔''

''یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اب ہماری اپنی تہذیب کا رنگ جمتا جارہا ہے، اور ہماری اپنی تہذیب اس سے زیادہ خوبصورت ہے''

''یہ تہذیب بھی اس کلچر کے اثرات سے خالی نہیں، کلچر گم نہیں ہوتا بلکہ قدرے مختلف روپ میں پھر سامنے آجاتا ہے۔''

''بابا! اس میں کلچر کا کیا کمال ہے۔ یہ تو دھرتی کا کمال ہے۔ جغرافیے کا کمال ہے۔ یہاں کی مٹی، یہاں کے دریا، پہاڑ، کھیت، جنگل، آب و ہوا، انہیں سے ہی تمہارے قدیم کلچر کی تشکیل ہوئی تھی اور انہیں عناصر ہی سے ہماری تہذیب بن رہی ہے اس میں جغرافیے کے ساتھ ساتھ ہماری ہسٹری بھی شامل ہوگئی ہے'' (افسانہ ''غریب بادشاہ'' سے اقتباس)

''میں تمہاری وجہ سے جنت بدر ہوا تھا مگر اب میں تمہاری وجہ سے زمین بدر نہیں ہوسکتا''

(افسانہ ''اندھی روشنی'' سے اقتباس)

''لڑکپن میں ایک بار اُسے اپنے باپ کے ساتھ ایک پہاڑ کی چوٹی پر جانے کا موقعہ ملا۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر اس نے نیچے دیکھا تو خوفزدہ ہوگیا۔ وہ بلندی اور پانی دونوں سے ڈرنے لگا۔ اسے زمین سے جڑے رہنے میں عافیت محسوس ہونے لگی۔'' (افسانہ ''گھٹن کا احساس'' سے اقتباس)

''پچھلی بار میں دس سال بھٹکنے کے بعد اتھاکا پہنچا تھا، اس بار مجھے علم ہے کہ میں اس مدت سے کہیں پہلے اپنے اتھاکا پہنچ جاؤں گا۔ لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، میں وہ اوڈیسس ہوں جسے کوئی ہومر نصیب نہیں۔ اس لئے مجھے ہومر کے حصے کا کام بھی خود کرنا ہے ہومر کے برعکس میری پریشانی یہ ہے کہ میری دونوں آنکھیں سلامت ہیں۔ اور مجھے کسی بادشاہ سے انعام واکرام بھی نہیں لینا ہے۔ آنکھیں کھلی ہوں تو ''دیکھنے'' کا عذاب جھیلنا پڑتا ہے۔ مجھے ابھی یہ عذاب جھیلنا ہے پھر اسے رقم کرنا ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ اس کے بعد ایک قیامت ٹوٹ پڑے گی لیکن مجھے یقین ہے کہ اسی قیامت میں کوئی طوفانی لہر یا شدید تھپیڑا مجھے اتھاکا پہنچا دے گا جہاں میرے عوام کے علاوہ میری پینی لوپی بھی شدت سے میرا انتظار کر رہی ہے۔'' (افسانہ ''۲۷۵۰ سال بعد'' سے اقتباس)

جدید سائنس نے انسانی زندگی پر دیرپا اثرات مرتب کیے ہیں۔ خصوصاً تباہی اور بربادی پھیلانے والے ہتھیاروں نے انسانی زندگی کی بقا کو کئی اندیشے لاحق کر دیے ہیں۔ اور انسان اب معمول کی زندگی میں بھی کئی قسم کے خوف و خطرات میں خود کو بے بس محسوس کر رہا ہے۔

حیدر قریشی کے افسانوں میں گو کہ زندگی خوف کی دبیز تہہ میں لپٹی نظر آتی ہے مگر وہ اس سے مایوس نہیں ہوتے اور ان کا بھروسہ زندگی کی بقا پر پختہ ہے۔حیدر قریشی اپنی کہانیوں میں درپیش حالات کی مماثلت ماضی کے ایسے ہی واقعات سے پیش کر کے زندگی کے ارتقائی عمل کو مہمیز دیتے ہیں اور امید کی لو ٹمٹماتی ہی سہی، روشن رکھتے ہیں۔ایسا ہی ایک افسانہ''حوا کی تلاش'' ہے۔اس کہانی میں ایٹمی جنگ کے بعد کے منظر اور خانہ کعبہ پر حملہ آور ابرہہ کے لشکر کی تباہی کی مماثلت بیان کی گئی ہے۔اور افسانہ نگار اپنے پرامید رویے کے باوجود ابابیلوں کے حملوں کے بعد رہ جانے والے کھائے ہوئے بھس کو ایٹمی جنگ کی پھیلائی ہوئی تباہ کاری سے کئی درجے بہتر خیال کرتا ہے۔اور انسانیت کو ایٹمی جنگ کی تباہ کاری اور ہلاکت سے آگاہ کرتا ہے۔اس افسانے کی اہم بات یہ ہے کہ افسانہ نگار کسی صحافتی مضمون کو اپنے دلکش اسلوب اور ایک تاریخی وقوعے سے مماثلت کی بنیاد پر اسے محض مضمون بننے سے بچا لیتا ہے اور کہانی کی خوبصورت آمیزش سے اسے ایک پر اثر افسانہ بنا دیتا ہے۔''حوا'' اس کہانی میں امید کا استعارہ ہے۔حوا کی علامت یوں بھی زندگی کے آغاز اور اس کی نشوونما کے طور پر برتی جاتی ہے۔اس افسانے کی ایک دلکش بات جس کا اجمالاً ذکر پہلے بھی ہوا ہے وہ 'حطم' اور 'ایٹم' کی صوتی مماثلت ہے۔یہ مماثلت نہ صرف یہ کہ صوتی اعتبار سے اہم ہے بلکہ ان الفاظ کی معنوی مماثلت بھی موجود ہے۔اور ایسا کیوں ہے اس کا علم تو ماہرین لسانیات سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔تاہم یہ دونوں الفاظ اپنے درمیان صدیوں کی دوری رکھنے کے باوجود اپنے معانی میں واضح ہم آہنگی رکھتے ہیں۔افسانہ نگار بڑی فنی چابکدستی سے ان الفاظ کی صوتی و معنوی مماثلت سے ان کے ہلاکت خیز اثرات کی وضاحت کرتا ہے اور زمین پر رینگتی زندگی کی بقا کی جدوجہد کی تصویر کشی کرتا ہے۔'حطم' کی وضاحت میں افسانے میں دی گئی قرآنی آیت کا ترجمہ دیکھئے۔

''تجھے کیا معلوم ہے کہ
حطم (ایٹم) کیا شئے ہے؟ یہ اللہ کی خوب بھڑکائی
ہوئی آگ ہے جو دلوں کے اندر تک جا پہنچے گی

تاکہ اس کی گرمی ان کو اور بھی زیادہ تکلیف دہ
محسوس ہو۔'' (حیدر قریشی مجموعہ''افسانے''
معیار پبلی کیشنز نئی دہلی)

جدید سائنس نے نہ صرف یہ کہ ایٹم کی تباہ کاری کا عبرت انگیز منظر دیکھا بلکہ اس نے اس کی تباہی کے مزید کئی اسرار بھی منکشف کیے ہیں۔البتہ''حوا کی تلاش'' افسانہ انسان ہی نہیں بلکہ کائنات کی تباہی کے خمیر پر دوبارہ زندگی کی طرف لوٹنے کی کہانی ہے۔اور یہ افسانہ اس امر کا اظہار ہے کہ اس کائنات کا اصل حسن تو زندگی میں ہی ہے۔داستانی انداز سے آگے بڑھتی ہوئی کہانی دراصل اپنا علامتی اور تشبیہاتی نظام تو ماضی سے لاتی ہے کہ جو آسمانی صحیفوں سے عبارت ہے اور صحیفوں کے مضامین کو کمال مشاقی سے افسانہ نگار نے استعمال کیا ہے۔کہ نہ صرف ان کی تخلیقی روح برقرار رہی ہے بلکہ وہ کہانی کا حصہ بھی معلوم ہوتے ہیں اور سارا منظر ایک خاص مذہبی وثقافتی روائیت سے الگ بھی محسوس نہیں ہوتا۔اس کہانی کی اہم خوبی یہی ہے کہ یہ مذہبی تمثیلوں کے سہارے سے ہی آگے بڑھتی ہے۔قیامت کے آنے کا بیان اور اس کا امکانی منظر نامہ اور اس کی ایٹم بم کی پیدا کردہ تباہی سے مماثلت اور پھر اسی جنت ارضی پر دوبارہ سے زندگی کے پیدا ہونے کا امکان اس کہانی کی اہم خصوصیات ہیں۔اس کہانی کی ایک اور اہم فنی خصوصیت ایک کہانی کے اندر دیگر کہانیوں کا ایک خاص ربط میں موجود ہونا ہے۔اس سے افسانہ نگار ایسا حسن پیدا کرنے میں کامیاب رہا ہے جو کہ قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے بلکہ آئندہ درپیش حالات کے درست ادراک کے لیے اسے تاریخ سے اخذ شدہ نتائج سے بھی آگاہ کرتا ہے۔اس طرح کی مذہبی تمثیلیں لانے سے یہ خدشہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کہانی سے کہیں دور نکل کر کسی مبلغ کا روپ نہ دھار لے۔مگر حیدر قریشی اس اندیشے کو ہی ختم کر دینے میں کامیاب رہتے ہیں اور وہ مذہبی واقعات، تلمیحات اور علامتوں استعاروں کو محض تخلیقی نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور انھیں کہانی کا حصہ بنا دیتے ہیں۔حیدر قریشی کا مذہبی استعارات وعلامات کا بیان کرنے میں مبلغ نہ بن جانے کی میری بات کی تائید ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی اپنے مضمون، میں یوں لکھتے ہیں:۔

"حیدر قریشی کے
افسانوں میں تاریخی حقائق کی جھلک اور
مشاہدات کی مہک ہے۔ مذہبی افکار وعقائد کے
اظہار میں ان کا وہ فنی سلیقہ بھی نمایاں ہے جو
انھیں خطیب ہونے کے الزام سے بری کرتا
ہے۔" (ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی، مطبوعہ "حیدر قریشی
کی ادبی خدمات" مرتب: پروفیسر نذر خلیق)

داستانی انداز بیان جس کی ایک اور بہترین مثال انتظار حسین ہیں ان کے ہاں بھی داستان مذہبی عناصر سے متشکل ہوتی ہے۔ کہانی کو مذہبی روائت سے کشید کرنے کا عمل حیدر قریشی کے ہاں صوفی ازم کی روائت سے جڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً "روشن نقطہ' اس طرز کے مضامین کی واضح مثال ہے۔ پیر، مرشد یا گرو کا کردار دراصل ہندی اسطورہ سے ادب میں داخل ہوا۔ تاہم جس طرح اساطیر انسان کا داخلی معاملہ ہوتے ہوئے بھی دراصل خارجی عوامل کا اظہار ہوتے ہیں اسی طرح پیر یا مرشد بھی گو کہ خارجی مظہر ہیں مگر یہ انسان کا مکمل داخلی اظہار ہیں۔ گویا ان کرداروں میں ڈھلی ہوئی کہانی کو ہم آسانی سے خود کلامی کہہ سکتے ہیں۔ اب مجھے شاید اس امر کی وضاحت کرنے میں تو دقت ہو مگر میں خود کلامی اور خود سے مکالمہ کرنے میں کچھ فرق سمجھتا ہوں۔ خود کلامی وجود کے اس کل سے ہوتی ہے جس کی تقسیم اگر ہو بھی تو فرد دو میں تقسیم نہیں ہوتا۔ جب کہ فرد کا خود سے مکالمہ ایک اختصاصی صورت رکھتا ہے جب وہ خود کو دو میں تقسیم کرتا ہے اور اپنے ہی منقسم وجود کو سوالوں کی زد پہ رکھ لیتا ہے۔ حیدر قریشی کے اسلوب میں یہ وصف نمایاں ہے کہ وہ ایک کردار کی ساری جہتوں کو مختلف مجسم کرداروں میں ڈھال لیتے ہیں اور پھر ان کے آپسی مکالمے سے کہانی کا دائرہ بناتے ہیں۔ مثلاً افسانہ "روشن نقطہ" کا سارا منظر اس منقسم وحدت میں ہے۔ 'میں' 'پیر سائیں' اور 'مجذوب فقیر' ایک مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں مگر دراصل وہ ایک ہی فرد کی مختلف جہتیں ہیں اور وہ تمام کردار حقیقت کی تلاش میں شک کی بنیاد پر رکھتے ہیں اور ایک مکالمے کے نتیجے میں "روشن نقطہ"

تک پہنچ جاتے ہیں۔ 'توحید' کا عرفان اس کہانی کا بنیادی موضوع ہے۔ اس بات کی طرف اس سے قبل بھی اشارہ ہو چکا ہے کہ کہ خدا کی شناخت حیدر قریشی کی کہانیوں کا بنیادی موضوع ہے۔ تاہم یہ شناخت وہ کہیں خارج میں نہیں کراتا بلکہ اس کا نقطہ نظر یہ ہے، جس خدا کو ہم خارج میں تلاش کر رہے ہوتے ہیں وہ تو دراصل انسان کے باطن کا معاملہ ہے:۔

"علم ایک نقطہ ہے جسے
جاہلوں نے بڑھا دیا ہے' مجذوب فقیر اپنی لے
میں بولا۔ الف تو بہت زیادہ ہے۔ بات ایک
نقطے میں تمام ہو چکی ہے۔
پیر سائیں مجذوب فقیر
کی بات سن کر تڑپے اور بے ہوش ہو گئے۔ دور
کہیں سے بلھے شاہ کی کافی گانے کی آواز آ رہی
تھی۔ اک نقطے وچ گل مکدی اے۔۔۔۔۔ پیر
سائیں اور مجذوب دونوں ایک نقطے میں ڈھل
گئے تھے۔ اس نقطے سے عجیب سکون بخش روشنی
پھوٹ رہی تھی۔
اور یہ روشنی میرے دل سے پھوٹ رہی تھی۔"

(حیدر قریشی، افسانے، معیار پبلی کیشنز نئی دہلی ۱۹۹۹ء ص۔۱۰۰)

افسانے کی آخری سطر اہم ہے۔ یہاں نہ صرف کردار ہمہ اوست میں ڈھل جاتے ہیں بلکہ اپنا کردار ادا کر چکنے کے بعد "میں" میں واپس آ جاتے ہیں۔ گویا کہانی محض ایک فرد کی ہی تھی اور پیر سائیں اور مجذوب فقیر اس تشکیک کے تلاطم کو کم کرنے کے لیے بیدار ہوئے اور "روشن نقطہ" تک پہنچنے کے لیے کردار "میں" کی رہنمائی کرنے کے بعد اس "میں" کا حصہ بن گئے جو کہ دراصل وہ خود تھے۔ البتہ ایک رویہ حیدر قریشی کے افسانوں سے خوف کا بھی ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً جہاں بھی

وہ اپنے کرداروں کا سامنا ''شر'' کی قوتوں سے کراتے ہیں وہاں انھیں اپنے کردار بچالے جانے کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔اور یہ خوف بعض اوقات سماجی سطح پر بھی ان کے کرداروں میں درآتا ہے۔ مجھے یوں لگا ہے کہ جیسے وہ سماجی سطح پر موجود گھٹن ہی کی وجہ سے اور مذہبی تنگ نظری کے باعث 'شر' کے نمائندہ کردار شیطان سے انسان کا واضح مکالمہ نہیں کراتے۔حالانکہ یہ کام حیدرقریشی بہتر کر سکتے تھے کہ اردو افسانے میں سوائے انتظار حسین کے اور افسانہ نگار یہ کام انجام دینے پر آمادہ نہیں ہے۔خصوصاً جدید افسانے میں وحدۃ الوجودی موضوعات و مضامین کا تذکرہ علامتی پیرائے میں رہا ہے البتہ بالواسطہ 'شر' سے اس سطح کا مکالمہ خال خال ہی نظر آتا ہے۔حیدرقریشی کا بھی اس موضوع سے صرف نظر کرنے کی وجہ ہمارے سماج میں مذہبی تنگ نظری کا موجود ہونا ہے۔

کہ اس راہ میں دو چار مقام سخت بھی آتے ہیں مگر ایک اہم بات یہ ہے کہ حیدرقریشی کے کرداروں کا یہ فرار وقتی ہے اور وہ معرکہ آرائی کا خیال لیے ہی جلد واپس آتے ہیں۔مثلاً ''دو کہانیوں کی ایک کہانی'' کے کرداروں کا جائزہ لیجیے۔'شاہ جی' اور 'میں' دراصل خود سے مکالمہ ہے۔اس سے پیشتر کہ شیطان ان کرداروں پر غلبہ پالے یہ اس منظر سے ہٹ جاتے ہیں۔سو میں اسے اس طرح کا فرار نہیں سمجھتا۔کیونکہ یہ کردار اپنے باطن کی سچائی سے آگاہ ہیں اور محض وقتی غلبے سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے اس مبارزت طلب منظر نامے سے ہٹ جاتے ہیں اور اپنے باطن کی روشنی سے آگاہی کے بعد دوبارہ اسی رزم میں اتر آتے ہیں۔ حیدرقریشی کے افسانوں میں جو خوف کی مجموعی فضا موجود ہے وہ فرار پر ہرگز نہیں ابھارتی بلکہ بار بار زندگی کی طرف پلٹاتی ہے۔فرار حیدر قریشی کے تخلیق کردہ کرداروں میں یوں بھی ممکن نہیں کہ وہ ایمان کے وجدانی تجربے سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔اور جہاں وجدان بھی ادراک سے قاصر ہو وہاں وہ معجزہ رونما ہوتا ہے جو انھیں منزل سے دوبارہ آگاہ کر دیتا ہے۔اور یہ بات طے ہے کہ جب انسان اپنے تمام معمولات میں مذہب کی حقیقتوں سے رہنمائی لیں گے تو معجزاتی عمل کے بھی منتظر ہوں گے۔اس سے یہ مراد بھی نہیں کہ حیدرقریشی کے افسانوں کے کردار خود سے کچھ کرنے سے قاصر ہیں یعنی بے عملی کا شکار ہیں۔ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ ان کا بار بار زندگی کی طرف پلٹنے کا رویہ انھیں مسلسل عمل پر اکساتا

ہے۔اور افسانہ نگار انسانی صلاحیتوں کو ہی دراصل کسی معجزے کا باعث خیال کرتا ہے۔

خوف دراصل انسان کی جبلت میں سے ہے۔البتہ خوف کی وجہ سے فرار کی سی کیفیت کا پیدا ہونا منفی صورتحال کی طرف اشارہ کرتی ہے۔مذہب کی مثبت اقداری فکر پر اپنے کرداروں کی عمارت استوار کرتے ہوئے حیدرقریشی فرار سے گریز کا رویہ ابھارتے ہیں۔البتہ مغلوب ہو جانے کے اندیشے سے وہ اپنے کرداروں کی بساط بدل دیتے ہیں:۔

''شاہ جی آپ نے کہا تھا کہ شیطان جنوں میں بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں بھی اور یہ کہ ہم شیطان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔'' (دو کہانیوں کی ایک کہانی)

اسی افسانے کے آخر میں اسی کردار کا ایک اور رویہ دیکھیے:۔

''تو تم نے نوکری چھوڑ
دی؟'' شاہ جی نے بے حد دکھی لہجے میں پوچھا۔
مجھے یوں لگا جیسے شاہ جی
نوکری اور کوارٹر چھوڑ آئے ہیں اور میں پیر جی کو
جواب دے کر آیا ہوں اور ہم دونوں شیطان
سے لڑ کر نہیں بھاگ کر آئے ہیں۔''

(دو کہانیوں کی ایک کہانی)

انسان دوستی بھی حیدرقریشی کی کہانیوں کا اہم موضوع ہے دراصل وہ اپنی کہانیوں میں اپنا مکمل نظریۂ حیات تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔اور یہ نظریہ ان کے بعض افسانوں میں اپنی مکمل اور واضح شکل میں متشکل ہوتا ہے۔نظریۂ حیات کی تلاش کسی بھی فن کار کے فن پارے سے تب ممکن ہوتی ہے کہ جب اس کے تخلیق کردہ کردار اپنی تخلیقی سطح پر ایسا مواد مہیا کریں جو اس فنکار کے عصر کی زندگی کی ترجمانی کرتا ہو۔حیدرقریشی کے ہاں دو طرح کے کردار اہم ہیں۔صوفیانہ مسلک اختیار کیے ہوئے یا کرتے ہوئے کردار اور دوسرے ایسے نوجوان کردار جن میں زندگی اپنے نئے راز کھولتی اور کروٹیں بدلتی ہوئی، جذبات بیدار کرتی ہوئی اور چہلیں لگاتی درآتی ہوئی ہے۔دراصل یہ کردار

ایک دوسرے کا پرتو ہیں۔ اور افسانہ نگار افسانہ کی موضوعاتی ضرورت کے تحت ان کرداروں کو استعمال کرتا ہے۔مثلاً افسانے کے دونو جوان کردار سماجی گھٹن پیدا کرتی ہوئی اخلاقی اقدار، مکالمے سے گریزاں زندگی، انسان کے جائز جبلی اظہار پر عائد پابندیوں اور تاریخ سے نفرت کے رویوں کے شدید مخالف ہیں۔

''کیا تمہیں پتہ ہے میں اپنے مذہبی تہوار منانے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے مذہبی تہوار بھی اسی عقیدت اور احترام کے ساتھ مناتی ہوں۔ کرسمس، بیساکھی، دیوالی......''

''یہ بڑی اچھی بات ہے اگر ساری قومیں اسی طرح ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنے لگیں تو دنیا میں مذہب کے نام پر کبھی کوئی فتنہ فساد پیدا نہ ہو'' (افسانہ''غریب بادشاہ'' سے اقتباس)

''انسان نے مختلف نظریات اور مزعومہ برتری کی لڑائیوں میں نفرت کی آلودگی بڑھائی، بلندیوں کی آرزو میں اوزون میں شگاف ڈال دیئے، صنعتی ترقی اور اسلحے کی دوڑ میں ماں جیسے مقدس پانی کو ناپاک کر دیا، جنگلوں کو اُجاڑ دیا، اتنے ہولناک نیوکلیائی ہتھیار بنا لئے کہ دھرتی کا دم گھٹ کر رہ جائے۔ یہ ساری بلندیاں انسانیت کو قبر میں گرانے والی ہیں۔ جیتے جی قبر میں گرانے والی، اور پھر اس کا دم گھٹنے لگتا۔ اس پر شدید گھبراہٹ طاری ہونے لگتی۔''

(افسانہ''گھٹن کا احساس'' سے اقتباس)

''پھر وہ رات، جب تک دونوں جاگتے رہے، دادا نے پوتے سے کہانیاں سننے میں گزار دی۔ اور اسی رات کہانی کار نے سوچا کہ اپنی ادھوری کہانی میں کسی امتیاز کے بغیر ہر مذہب و مسلک کے سارے کے سارے انتہا پسندوں کو ایٹمی جنگ سے

ہلاک کر کے صرف اپنے پوتے جیسے انسانوں کو بچایا جائے اور انہیں کے ذریعے نسلِ انسانی کو پھر سے دھرتی پر آباد کیا جائے۔ لیکن ابھی یہ صرف کہانی کار نے سوچا ہے، کہانی لکھتے وقت کیا روپ اختیار کر جائے! اس کا تو خود کہانی کار کو بھی علم نہیں ہے۔''

(افسانہ'' کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار'' سے اقتباس
مطبوعہ جدید ادب جرمنی شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۶ء)

وہ ایک ایسے پر امن معاشرے کی کھوج میں ہیں جہاں انسان کو مذہب کے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے دیکھنے کی بجائے فقط انسان سمجھا جائے۔ اسی لیے وہ تاریخ کا سفر کرتے ہیں۔ دراصل وہ تاریخ کی آگاہی سے ایسے سماج کی مثالیں لاتے ہیں جہاں انسان مختلف خانوں میں تقسیم نہیں تھا۔ اور نہ ہی انسانوں میں کسی برتری کا تعصب موجود تھا۔

حیدر قریشی کے افسانوں میں قدرے ڈھلتی عمر کے کردار 'ہمہ اوست' کا نظریہ اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔ یعنی نوجوان کردار تاریخ سے آگاہی میں دراصل یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ایسا نظریۂ زندگی موجود رہا ہے جو انسانوں کو منقسم نہیں کرتا۔ تو یہی کردار جب اپنی عمر کی پختگی کو پہنچتے ہیں تو وہ 'ہمہ اوست' کا نظریہ اختیار کر لیتے ہیں۔ دراصل برصغیر کی تہذیب میں ان صوفیوں کا کردار خالصتاً انسان دوست تھا۔ جہاں پہلے برہمن اپنے علاوہ باقی تمام انسانوں کو بھرشٹ سمجھتا تھا وہیں مغل حکمران بھی انسانوں سے ایسا ہی سلوک روا رکھتے تھے۔ البتہ صوفیوں کا راستہ اور انداز نظر جداگانہ تھا۔ اسی لیے حیدر قریشی اس صوفیانہ فلسفے کو زندگی کے فلسفے کے طور پر لیتے ہیں۔ گویا ان کے کردار اجتماعی سطح پر ایک نظریۂ زندگی تشکیل دیتے نظر آتے ہیں۔ چونکہ ادب کی قدریں زندگی کی قدروں سے ہی اخذ کی جاتی ہیں اس لیے وہ دائمی تو یقیناً نہیں ہوتیں اور ان میں تغیر رونما ہوتا رہتا ہے لیکن انسان دوستی ایسا رویہ ہے جسے حیدر قریشی نئے سائنسی علوم سے آراستہ کر کے زندگی کا قابل قبول نظریہ بنا دیتے ہیں۔

انسانی ثقافت وتمدن کی بوقلمونی دراصل انسان کی معاشرتی زندگی کی ہمہ رنگی کی علامت ہوتی ہے۔ البتہ زندگی بسر کرتے انسان اپنی بقا کے لیے کیا رویہ اختیار کرتے ہیں اس کا فیصلہ ان

کے موجود رویے سے ہونا ہوتا ہے۔ حیدرقریشی کے ہاں ایک المیہ بطور سماج پاکستانی قوم کی انا کا گروی رکھا جانا بھی ہے۔

جنس اور بھوک کو وہ انسان کی بنیادی جبلت قرار دیتے ہیں کہ جن کے بغیر زندگی اپنی کوئی بھی صورت مکمل نہیں کر پاتی۔ قدیم اسطورہ میں گندم کے دانے کی ظاہری شکل اور نسوانی جنسی اعضا کی مماثلت کی وجہ سے انھیں بنیادی گناہ کا سبب سمجھا گیا۔ جبکہ آدم کا جنت میں سے نکلنا، جس کا حوالہ حیدرقریشی کی کہانیوں میں اکثر آیا ہے، گندم ہی کی وجہ سے تھا۔ جنت سے اس اخراج کی تعبیریں مختلف کی جاسکتی ہیں۔ اور ممکن ہے کہ یہ ثقافتی اور جبلی مسئلہ بھی ہو کہ ہمارے سماج کے لیے گندم اہمیت رکھتی ہے اس لیے جنت سے آدم کے نکالے جانے کا باعث گندم کو سمجھا جاتا ہے جبکہ عرب ممالک میں یہی روایت سیب کھانے کی ہے تاہم دونوں صورتوں میں یہ عمل جنسی کشش محسوس ہونے کے بعد کے جنسی عمل کا اظہار ہے۔ البتہ حیدرقریشی اس افسانے ''اندھی روشنی'' میں جس بنیادی المیے کا ذکر کرتے ہیں وہ مختلف ہے۔ اور وہ المیہ تب جنم لیتا ہے جب پاکستان جیسا زرعی ملک اپنی زرخیز زرعی زمینوں سے مالا مال ہونے کے باوجود قحط جیسی صورتحال کا سامنا کرنے پر امریکی گندم درآمد کرتا ہے۔

''آج صبح کے اخبارات میں قوم کو یہ نوید سنائی گئی ہے کہ قحط کے خطرے کے پیش نظر ایک دوست ملک سے طویل مدت قرض کی بنیاد پر کئی ہزار ٹن گندم خریدنے کے ایک معاہدے پر دستخط ہو گئے ہیں۔ میرے اندر کا ''میں'' سورج نکلنے سے پہلے ہی مر گیا ہے۔

☆☆

میں پھر اپنی حوا کو ملنے چلا گیا ہوں۔ پھر وہی رشنیاں ہیں.....وہی موسیقی ہے اور وہی رقص ہیں۔ میری وہ کرسی اب خالی پڑی ہے۔
یہ روشنیاں اب مجھے راس آ گئی ہیں اور میرا اندھا پن ختم ہو گیا ہے۔
اب میں اس کے اشاروں پر نہیں ناچ رہا بلکہ اسے اپنے اشاروں پر نچا رہا

ہوں.....لیکن یہ کیا.....؟ سامنے دیوار پر نصب آئینے میں میرے اندر کے ''میں'' کی بے کفن لاش مجھے گھور رہی ہے۔ میں گھبرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہوں۔
لیکن ادھر بھی بڑا آئینہ نصب ہے اور اس میں بھی وہی منظر ہے میرے چاروں طرف میری لاشیں بکھری ہوئی ہیں اور میں سوچ رہا ہوں:
''کاش میرا وہ اندھا پن ہی لوٹ آئے''
موسیقی کا شور کچھ اور بڑھ گیا ہے۔ ہمارے رقص کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔
لیکن ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہے۔ ہم بے زمین ہو گئے ہیں۔
صرف اپنی لاشوں پر کھڑے رقص کر رہے ہیں۔''
(افسانہ ''اندھی روشنی'' سے اقتباس)

افسانہ ''اندھی روشنی'' کے اس اقتباس کے بعد اس پر مزید بات کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ افسانہ حیدرقریشی کا سب سے پہلا افسانہ تھا۔ یہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں سال ۱۹۷۸ء میں لکھا گیا۔ اس سلسلہ میں حیدرقریشی کا یہ بیان ایک دلچسپ انکشاف بھی ہے:

''میرے نام سے میرا پہلا افسانہ ''ماَمتا'' ''اوراق'' کے ۱۹۸۰ء کے پہلے شمارہ میں شائع ہوا۔ یوں یہ میرا پہلا افسانہ ہوا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے میں افسانہ ''اندھی روشنی'' لکھ چکا تھا اور یہ افسانہ 'جدید ادب' خانپور کے ۱۹۷۸ء کے کسی شمارہ میں اپنی بیوی (مبارکہ شوکت) کے نام سے چھاپ چکا تھا۔ تب رشید امجد اور بعض دیگر جدید افسانہ نگاروں نے چونکتے ہوئے استفسار کیا کہ یہ مبارکہ شوکت کون ہیں؟ تو مجھے اپنے افسانہ لکھنے پر اعتماد سا ہونے لگا۔''
(''اوراق اور میں'' از حیدرقریشی
ادبی جریدہ ''اوراق'' لاہور۔ شمارہ جنوری، فروری ۲۰۰۰ء پینتیس سالہ نمبر۔ ص ۲۷۲)

اس افسانے کو بعد میں شاہد ماہلی کے ادبی رسالہ ''معیار'' دہلی نے افسانے کے پاکستانی انتخاب میں حیدرقریشی کے نام کے ساتھ شامل کیا۔ اور اسی انتخاب کو ''نیا پاکستانی افسانہ۔ نئے دستخط'' کے

نام سے کتابی صورت میں ۱۹۸۳ء میں شائع کیا۔

اپنے موضوع کے اعتبار سے اس کہانی کا موضوع کہانی سے زیادہ اخباری کالم اور فکری مباحثوں کے لیے سود مند تھا۔ مگر حیدرقریشی بڑی فنی وتیکنیکی چابکدستی سے اسے تاریخی حوالوں، مذہبی اساطیر وتلمیحات کے حوالے سے افسانے میں لے آئے ہیں۔ اور بڑے ربط کے ساتھ درآمد ہونے والی گندم سے بعد کی صورت حال کی عکاسی کی ہے۔ ''اندھی روشنی'' اس حوالے سے اہم افسانہ ہے کہ اس ایک افسانے میں موضوعاتی تنوع ہے جسے افسانہ نگار بڑی چابکدستی سے ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔ افسانے کے شروع میں تیز روشنیاں کسی کلب کے منظر کی تصویر دکھاتی ہیں۔ پھر مرد اور عورت کی ازل سے چلتی آتی بحث کہ جس میں مرد ہمیشہ عورت پر ہی الزام دھرتا ہے اور عورت اپنا جسم اسے بخشنے کے باوجود بھی خود کو گناہ گار سمجھتی ہے۔

''لیکن گندم۔۔۔۔
سنو،۔۔۔۔ وہ چلاتے
ہوئے بولی۔ گندم کی ہئیت پر غور کرو اور اپنی اس
کمزوری پر بھی غور کرو جس کے بغیر تم رہ نہیں
سکتے۔ بڑے بڑے تجرد پسند جس کے لیے بالآخر
مجبور ہوگئے۔
تم فحش اور ننگی باتیں کر رہی ہو۔
سچ کا کوئی لباس نہیں
ہوتا۔ اسی لیے ننگا نظر آ رہا ہے۔''
(اندھی روشنی)

سچ واقعی تلخ ہوتا ہے اسی لیے حیدرقریشی پورا سچ بولنے سے گریز کرتے ہوئے اسکی جھلک دکھا جاتے ہیں۔ اور اس بنیادی المیے کی طرف توجہ کرتے ہیں جو پاکستانی سماج کو اندر سے کھوکھلا کرنے والا ہے۔ کیونکہ افسانہ نگار گندم کی درآمد کو محض گندم کی درآمد تک ہی نہیں دیکھ رہا بلکہ

وہ اس کے پس منظر میں ایک نظریہ زندگی اور ایک برتر ثقافت کے آنے کی چاپ بھی محسوس کر رہا ہے۔ اور پھر ایسا ہی ہمیں درپیش بھی ہوتا ہے۔ نئی اور ترقی یافتہ ثقافت کے اثرات جب اس سماج پر پڑنا شروع ہوئے تو ہمارا معاشرہ دو انتہاؤں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک وہ جو اپنی اقدار کو فرسودہ سمجھ کر نئی اقدار کی کورانہ تقلید کرنے لگا اور دوسرا طبقہ وہ طبقہ تھا جو تاریخی عمل میں بدلتی اقدار کا ساتھ تو شاید دے رہا تھا مگر ایک دم بدلتی صورتحال کا سامنا نہ کرسکنے کے باعث تنگ نظری کا شکار ہوگیا اور اسی طبقے کے المیے سے افسانہ ''اندھی روشنی'' کی کہانی جنم لیتی ہے۔ یعنی روشنی اس قدر ہوگئی ہے کہ کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔ یوں ایک بے یقینی کی کیفیت جنم لیتی ہے اور بے یقینی کی اس کیفیت میں افراد باہم مشورے سے کسی حل تک پہنچنے کی بجائے ایک دوسرے کو موردالزام ٹھہراتے ہیں۔

جیلانی کامران اس ساری صورتحال کی عکاسی یوں کرتے ہیں:۔

''ان افسانوں کی دنیا
ایسی ہے جس کی اندھیری جہتوں سے باہر نکلنا
دشوار ہے۔ اس لیے ان کہانیوں کے افراد
اندھیرے شب و روز میں اپنے ہونے اور نہ
ہونے کے آشوب سے دوچار ہیں۔ ان کی نظر
میں سچائیاں اضافی ہوچکی ہیں۔۔۔۔ تاہم ان
کے افسانوں کے لوگ ایسے ہیں جو اپنے آپ کو
الزام دینے سے کتراتے ہیں''(جیلانی کامران
پیش لفظ افسانوی مجموعہ ''روشنی کی بشارت'')

حیدرقریشی کے افسانوں کا ایک اور اہم موضوع معدوم ہوتی زندگی کا المیہ ہے۔ معاشرے میں چھائی ہوئی بیگانگی اور زندگی سے بے رغبتی کا اظہار ان کے ہاں بڑا شدید ہے گو کہ وہ اپنے شعور کی مدد سے لوگوں کو یا سماج کو ایک متعین راہ دکھاتے ہیں لیکن وہ ان کے طرزِ عمل کو نہ بدل سکنے کا المیہ بھی دکھا دیتے ہیں۔ ''دھند کا سفر'' اس ساری صورتحال کی نمائندہ کہانی ہے۔ کہانی

میں بچے کا کردار مستقبل کا نمائندہ ہے۔

''ایک اسٹیشن پر مسافروں کا ایک بڑا تیز ریلا اندر آتا ہے۔ چھوٹے سے اسٹیشن پر اتنے مسافر!.....شاید کوئی بارات ہو۔! گاڑی چلتی ہے تو مسافروں کے اوسان بحال ہونے لگتے ہیں۔ ایک مسافر نے ٹرین کے چیکر کو ایک ایسی گالی دی ہے کہ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے ہیں۔ دو چار اور مسافروں نے بھی ایسی ہی گالیاں دیں تو پتہ چلا سارے بے چارے فرسٹ کلاس کے فرش پر بیٹھے تھے۔
سب سے دس دس روپے جرمانہ وصول کر کے بغیر رسید کے سب کو اس ڈبے میں دھکیل دیا گیا ہے۔

گالیوں کا سلسلہ بڑھنے لگتا ہے۔ گالیاں ریلوے کے مختلف افسران سے ہوتی ہوئی ریلوے کے چیئرمین تک پہنچ چکی ہیں۔ پھر وزیر ریلوے بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ بالکل میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک ''یک چشم'' داڑھی والے نے دانت پیستے ہوئے بابائے قوم کو بھی گالی دے دی ہے۔
میں سناٹے میں آ گیا ہوں۔ اس کی بدزبانی پر کوئی احتجاجی آواز بھی نہیں ابھری۔

مجھے لگتا ہے ہم سب زمین میں دھنستے جا رہے ہیں۔

گردن تک ہم زمین میں دھنس گئے ہیں۔

میرے اندر کا وہ پانچ سالہ بچہ نکل کر زنجیر کے پاس جا کھڑا ہوا ہے اور میرے اشارے کا منتظر ہے۔ میں اس یک چشم داڑھی والے کو سخت لعن طعن کرتا ہوں۔
''بابائے قوم کا کیا قصور ہے؟ یہی کہ اس نے تمہیں آزادی دلائی ہے.....میں لمبی چوڑی تقریر کرتا ہوں۔ مگر وہ یک چشم داڑھی والا بڑی متانت سے پھر وہی گالی بابائے قوم کا نام لے کر دہراتا ہے۔
آخر میں اپنے اندر کے اس پانچ سالہ بچے کو اشارہ کرتا ہوں کہ وہ زنجیر کھینچ دے مگر

اس دوران ہی ایک بے حد خوبصورت خاتون سے اس کی آنکھیں چار ہوتی ہیں اور وہ جوان ہونے لگتا ہے۔ پہلے وہ زنجیر کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اب اس خوبصورت خاتون کو حیرت سے دیکھ رہا ہے۔ میں خود آگے بڑھ کر زنجیر کھینچ دیتا ہوں۔۔۔''

(افسانہ ''دھند کا سفر'' سے اقتباس)

ریل گاڑی منزل تک پہنچنے کا اجتماعی سفر ہے۔ اور اس میں افسانہ نگار سماجی منافقت کے مختلف مظاہر کا نظارہ کراتا ہے۔ اور وہ بچہ جو کہ اپنے معاشرے کے مجموعی مزاج سے الگ ابھی سچ بولنے کو اہم سمجھتا ہے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اور بانی پاکستان کو گالی دینا گویا کوئی ایسا عمل نہیں کہ جس پر گرفت کی جا سکے۔ یوں زندگی کی ایک بے معنی صورت نمایاں ہوتی ہے کہ قانون ہمیشہ کمزور پر تو اپنا اثر دکھاتا ہے مگر کچھ افراد اس سے بھی بالا ہوتے ہیں۔

''گاڑی رک گئی ہے۔ ریلوے گارڈ، ٹکٹ چیکر اور کچھ پولیس والے آ چکے ہیں۔
میں انہیں بتاتا ہوں کہ اس ذلیل شخص نے بابائے قوم کی شان میں گستاخی کی ہے۔
مگر شاید ریلوے کے عملہ کو میری بات سمجھ نہیں آتی۔ گارڈ اور چیکر میری بات سے جھلا گئے ہیں۔ اور پھر چیکر میرے جرمانے کی رسید کاٹنے لگتا ہے۔

پچاس روپے جرمانہ ادا کرتے ہوئے میرے ہونٹوں پر وہی گالی مچلتی ہے جو اس سے پہلے وہ یک چشم داڑھی والا بابائے قوم کے خلاف بکتا رہا تھا۔ مگر میں گالی کو ہونٹوں پر اترنے سے پہلے ہی روک لیتا ہوں۔ پتہ نہیں بابائے قوم کے احترام کے باعث یا ان پولیس والوں کے باعث جو ریلوے گارڈ اور ٹکٹ چیکر کے ساتھ کھڑے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ میں ایک دم چھوٹا ہوتا جا رہا ہوں اور گھٹتے گھٹتے ایک نقطے میں ڈھل گیا ہوں زنجیر کے نیچے کھڑا پانچ سالہ ''میں'' پھر حیرت سے اس تحریر کو پڑھ رہا ہوں۔

''گاڑی ٹھہرانا مقصود ہو تو زنجیر کھینچئے
بلاوجہ زنجیر کھینچنے والے کو پچاس روپے جرمانہ ہوگا''

افسانہ ''دھند کا سفر'' سے اقتباس)

دراصل یہ کہانی پاکستان کی سیاسی صورت حال کی عکاس ہے۔حیدر قریشی کی دیگر کہانیوں میں بھی اس صورت حال کی نشاندہی ہے مگر یہ کہانی اپنے موضوع کی نمائندہ کہانی ہے۔اسی صورت حال کی عکاس ایک اور کہانی ’’بے ترتیب زندگی کے چند ادھورے صفحے‘‘ بھی ہے۔

’’دھند کا سفر‘‘ اور اس نوع کی دیگر کہانیوں سے حیدر قریشی کا یہ وصف بھی نمایاں ہوتا ہے کہ وہ سماج کی متضاد باتوں کو موضوع بنا کر ایک گہرا نشتر چلاتے ہیں۔ ریل گاڑی ایک اجتماعی سفر کا استعارہ ہے اور ہماری پوری زندگی پر محیط ہے۔ یہاں وہ ہماری معاشرت میں پھیلی منافقت کی عکاس ہے۔کوئی شخص اگر معاشرتی بگاڑ کی نشاندہی کرنا بھی چاہتا ہے تو معاشرہ اس سے اس قدر ناروا سلوک کرتا ہے کہ وہ خود بھی گویا نمک کی کان میں نمک بن جاتا ہے۔

حیدر قریشی کے افسانوں کے کردار ایک خوف کا شکار رہتے ہیں اور مکمل سچ جاننے کے باوجود اس کے اظہار میں سماجی جبر کے خوف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ان کے نفسیاتی رجحانات کا مطالعہ ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے۔لیکن یہ تمام کردار سچ کا اظہار نہ کر سکنے کے باعث زندگی سے گریز کا رویہ اپناتے ہیں۔اور مستقبل ان کے لیے دھند میں گم ہو جاتا ہے۔کہیں کہیں ایک ردعمل کی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے۔اور یہ ردعمل اس نظام کی بساط ہی لپیٹ دینے پر آمادہ کر دیتا ہے۔مگر دھندلکے میں واضح نظر نہ آنے کے باعث ان کے کردار اس ردعمل کا اظہار اپنی ہی ذات کی نفی کر کے کرتے ہیں۔اور اپنی ذات کی نفی کا ایک اظہار وحدت الوجود میں بھی ہے۔اور یہ مثبت بات ہے کہ وہ اپنی نفی کرتے ہوئے جہانِ دیگر کی سیر کو نکل جاتے ہیں۔

> ’’یہ کیا بھید تھا؟ میں خوشی اور حیرت سے مغلوب ہو گیا۔میں نے اپنی یہ واردات سارے عزیزوں اور دوستوں کو سنائی۔کسی نے مجھے رشک بھری نظروں سے دیکھا اور کسی نے اسے میرا وہم قرار دیا۔ابا جی نے کہا کہ جو کچھ ہوا تھا اسے اپنے تک رکھنا تھا۔تم اس اسرار کو برداشت نہیں کر سکے اس لئے اب آئندہ ایسے تجربے کی لذّت سے محروم کر دیئے جاؤ گے۔اور واقعی میں ایسے تجربے کی لذت سے محروم ہو گیا لیکن روحانیت سے میرا لگاؤ بڑھ گیا۔میرے شکوک و شبہات ختم ہو گئے۔‘‘

(افسانہ ’’بھید‘‘ سے اقتباس)

حیدر قریشی کہانی کا انداز مذہبی تلمیحات کے کثرت استعمال کے باوجود برقرار رکھتے ہیں اور کہیں بھی اسے گرفت سے نکلنے نہیں دیتے۔

حیدر قریشی کے ہاں کئی کہانیوں میں خون کے رشتوں کردار تو ملتے ہیں لیکن انسان کے خون کے رشتوں پر کہانیاں کم ہیں۔شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہوں نے اپنے خاکوں اور یادوں میں براہِ راست خون کے رشتوں کی کہانیاں لکھ دی ہیں۔افسانوں میں صرف ’’مامتا‘‘ ایسی کہانی ہے جو ذاتی تعلق سے اوپر اٹھ کر ان کے مکمل انسان دوستی کے نظریے سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ ’’مامتا‘‘ دراصل سوتیلے پن سے عاجز ایک عورت کی کہانی ہے۔عورت درحقیقت، کیسا بھی سماج تاریخ میں رہا ہو، ہمیشہ استحصال کا شکار رہی ہے۔اور اس کے تمام روپ چاہے انھیں مذہبی صحیفوں نے مقدس ہی کیوں نہ قرار دیا ہو مگر پھر بھی وہ اس کے استحصال کو کم نہیں کر سکے۔حیدر قریشی اس افسانے میں اس سوتیلے پن کو ایک لعنت کے طور پر ابھارتے ہیں۔اور زندگی کی ساری تلخیوں کو وہ اپنے قاری کے سامنے واضح کر دیتے ہیں۔

اس امر کی وضاحت پہلے بھی کی جا چکی ہے کہ وہ کہانی کو مقصدی شعوری طور پر نہیں بناتے البتہ وہ ایسے تخلیقی زاویے سے بات کرتے ہیں کہ قاری کہانی کے بین السطور ایک اور کہانی کے ذائقے سے روشناس ہوتا ہے اور وہ خود بخود اس گہرے طنز کا نشتر محسوس کرتا ہے اور اپنے کردار کا موازنہ کہانی کے کرداروں سے کرنے لگتا ہے۔یہ اہم بات ہے کہ جب قاری افسانے میں موجود کردار پر رحم کھانے کی بجائے اپنا تقابل اس سے کرتا ہے اور اپنی شخصیت میں موجود کجی سے آگاہ ہو جاتا ہے تو وہ یقیناً اسے بدلنے پر آمادہ بھی ہو سکتا ہے۔

ان کہانیوں کے حوالے سے جو ایک مجموعی تاثر بنتا ہے ان میں ان کا داستانی اسلوب حیدر قریشی کی علیحدہ شناخت اور انفرادیت کا سبب بنتا ہے۔عصری مسائل کا واشگاف اظہار اور انسانی زندگی کی بے توقیری کا المیہ ان کی کہانیوں کا بنیادی موضوع ہے۔

جوگندر پال اپنے مضمون میں حیدر قریشی کی کہانیوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''حیدرقریشی اس وسیع
تر زندگی کی دریافت کے لیے اپنی کہانیاں تخلیقتا
ہے۔ اپنے اس کھلے راستے کو طے کر کے اسے
دور یا نزدیک کسی شیشے کے محل میں اقامت نہیں
اختیار کرنا ہے بلکہ راستوں سے راستوں تک
پہنچنا ہے اور ہر راستے پر تباہ حال زندگی کی
بازآبادکاری کیے جانا ہے۔۔۔۔اس کی تخلیقات
میں تاکید اور اصرار کے عناصر کا شاید یہی جواز
ہے کہ وہ تحریر کو بے ضرر آرائشوں کی حدود سے
باہر لا کر اسے کارکردگی کا فعال ذریعہ بنالینا چاہتا
ہے۔ایسی ہی تخلیقی شرکتیں گنجان ہو کر آخر کسی
دیرپا آہنگ کی پیامبری کی اہل ہوجاتی
ہیں۔''(جوگندر پال ''روشنی کی بشارت کے
افسانے'' بحوالہ:''حیدرقریشی کی ادبی خدمات''
مرتب پروفیسر نذر خلیق ص ۱۹۴)

حیدرقریشی نے اپنے افسانوں میں بعض جگہوں پر پنجابی لفظیات کا استعمال بھی بڑے سلیقے اور فنی عمدگی سے کیا ہے۔ جملے کی ساخت پر حیدرقریشی بڑی توجہ دیتے ہیں۔لگتا ہے کہ وہ کہانی لکھنے کے بعد کے عمل سے بخوبی واقف ہیں اور کہانی کی واقعاتی ضرورتوں کی مکمل آشنائی رکھتے ہیں۔افسانے میں برتے گئے جملوں کے مابین ربط اور اختصار میں جامعیت ان کا نمایاں وصف ہے۔کہانی کی ضرورت سے زائد جملہ اور جملے کی ضرورت سے زائد لفظ استعمال نہیں کرتے۔

ایک اور اہم بات جس کا اظہار میں اپنے اس مقالے کے آخر میں ہی کرنا چاہتا تھا وہ ہر کہانی کے آغاز میں ان کا اپنا ایک شعر کا ہونا ہے۔اور میں اس سلسلے میں قیصر تمکین کے اس تبصرے

سے متفق ہوں۔وہ لکھتے ہیں:۔

''۔۔۔۔۔حیدرقریشی کی ہر کہانی کی ابتدا ایک
شعر سے ہوتی ہے ۔ یہ طرز بیسویں صدی کے
ابتدائی برسوں میں بہت مروّج تھا۔ایم اسلم تو
اس کے ماہر تھے۔لیکن تقسیم ہند کے بعد یہ ادبی
نوادر خانوں میں نسیاً منسیاً ہوگیا۔حیدرقریشی نے
اس طریقے کو نسیان خانوں سے نکال کر پھر
استعمال کیا ہے۔ لیکن ایک ندرت کے
ساتھ۔۔۔۔ دوسرے قلم کار ''اقوال زریں''
کے طور پر اشعار یا کہاوتوں کو استعمال کرتے ہیں
حیدرقریشی نے ہر نفس مضمون کی وضاحت کے
لیے خود اپنے ہی اشعار پیش کیے ہیں۔اور یہ کہنا
واقعی ناممکن ہے کہ انھیں اس میں کامیابی نہیں
ہوئی ہے۔''(قیصر تمکین۔مضمون ''افسانے''
مطبوعہ حیدر قریشی کی
ادبی خدمات مرتب: پروفیسر نذر خلیق ص۲۰۱)

حیدرقریشی بلاشبہ اپنے عہد کا نباض افسانہ نگار ہے۔ جو تلخ سماجی حقیقتوں کے گھونٹ پیتا ہے اور پھر اپنے قاری کو کہانی سنانے بیٹھ جاتا ہے تو اس کی دلچسپیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے ان حقائق سے بھی آگاہ کر دیتا ہے جن سے قاری بے خبر ہوتا ہے۔

حیدرقریشی کا کہانی کہنے کا انداز تیکھا مگر دلنشیں ہے وہ قاری کو حیرتوں میں گم کر دیتے ہیں تو ساتھ ہی اسے نئی دنیاؤں کے راستے بھی سجھاتے ہیں۔گویا اس ان کا فلسفہ عمل کا فلسفہ ہے۔

اور وہ سب سے پہلے انسانوں کے درمیان مذہب کی دیوار، سماج کی دیوار اور طبقے کی دیوار گرا کر اسے اس بے گانگی سے نجات دلانا چاہتا ہے جس نے اس کی زندگی کی شہزادی کو سامری جادوگر کے جال میں پھنسا رکھا ہے۔

حیدر قریشی تمام انسانوں کو ایک شمار کرتے ہیں اور بلاشبہ انسان دوستی کے بہت بڑے پرچارک ہیں۔

کلثوم رقیّہ

تیس افسانوں کی فہرست

''روشنی کی بشارت'' کے افسانے

۱۔میں انتظار کرتا ہوں: ۱۹۸۳ء کی چھپی ہوئی یہ کہانی جس میں سوتیلے رشتوں کے ظلم کی تین کہانیوں کو ایک کردار میں یکجا کیا گیا ہے، نائن الیون کے سانحہ کے بعد بالکل آج کی تازہ کہانی لگتی ہے۔مزید تفصیل کے لیے دیکھیں ''پرانی تحریریں، نئے حالات'' کتاب ہذا صفحہ نمبر

۲۔گلاب شہزادے کی کہانی: ایٹمی جنگ کی کہانی۔۔تیل کی دولت کی حرص میں انسانیت کی تباہی۔

۳۔غریب بادشاہ: اضافی تہذیبی و عمرانی حوالوں کے ساتھ بنیادی طور پر ایک لَو سٹوری۔جبکہ اردو کے جدید افسانے میں محبت کی کہانیوں کے موضوع کو بڑی حد تک نظر انداز کیا گیا ہے۔

۴۔دُھند کا سفر: اس پر مناسب تبصرہ ہو چکا ہے۔

۵۔آپ بیتی: ایک معاشرتی کہانی

۶۔ایک کافر کہانی: صوفیانہ تجربات کی کہانی جو اپنے عہد کے مذہبی جبر کے خلاف ایک مزاحمت بھی ہے۔

۷۔روشنی کی بشارت: نیطشے کی اس مشہور تمثیل کے اقتباس سے شروع ہونے والی کہانی جس میں اس نے نعوذ باللہ خدا کی موت کا اعلان کیا تھا۔اس افسانہ میں زمین و آسمان کے نور ذاتِ باری کی حقیقتِ عظمیٰ کا اثبات تخلیقی سطح پر کیا گیا ہے۔اور یوں نیطشے کی خام خیالی کا بطلان کیا گیا ہے۔

۸۔مامتا: کامران کاظمی کے مضمون میں اس پر مناسب تبصرہ ہو چکا۔

۹۔اندھی روشنی: کامران کاظمی کے مضمون میں اس پر مناسب تبصرہ ہو چکا۔

۱۰۔حوا کی تلاش: کامران کاظمی کے مضمون میں اس پر مناسب تبصرہ ہو چکا۔

۱۱۔اپنی تجرید کے کشف کا عذاب: ۱۹۸۰ء کی یہ کہانی آج کے عالمی حالات پر منطبق ہو رہی ہے۔مزید تفصیل کے لیے دیکھیں ''پرانی تحریریں، نئے حالات'' کتاب ہذا صفحہ نمبر

۱۲۔بے ترتیب زندگی کے چند ادھورے صفحے: اس پر کسی حد تک تبصرہ ہو چکا۔

۱۳۔پتھر ہوتے وجود کا دکھ: لَو سٹوری۔۔۔جس پر ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا: "پتھر ہوتے وجود کا دکھ "بہت عمدہ افسانہ ہے۔اگر آپ اسی رفتار اور انداز سے آگے بڑھتے رہے تو بہت جلد صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں شمار ہونے لگیں گے۔۔۔اور مظہر امام نے لکھا: ''پتھر ہوتے وجود کا دکھ'' بڑا خوبصورت افسانہ ہے۔کم سے کم لفظوں میں آپ نے زندگی کے کتنے پہلوؤں کا احاطہ کر لیا ہے۔آپ کی زبان میں روانی اور شیرینی ہے۔میں نئے افسانے میں اچھی زبان کے لیے ترس گیا ہوں، آپ کا افسانہ پڑھ کر بڑا سکون ہوا۔''

''قصے کہانیاں'' کے افسانے

۱۔کاکروچ: ایٹمی جنگ کے بعد کی فضا کے موضوع پر افسانہ

۲۔روشن نقطہ: صوفیانہ مزاج کی کہانی، مناسب تبصرہ ہو چکا ہے۔

۳۔دو کہانیوں کی ایک کہانی: کسی حد تک مناسب تبصرہ ہو چکا۔

۴۔گھٹن کا احساس: جدید عہد کے صنعتی مسائل سے جنم لیتے نفسیاتی احساسات کی کہانی

۵۔بھولے کی پریشانی: بڑی عمر میں شادی کرنے اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اخلاقی مسائل کے حوالے سے ایک سیدھی سادی معاشرتی کہانی۔

۶۔شناخت: ہندوستان میں زبردستی سکھ بنا لی جانے والی ایک مسلمان خاتون کی درد بھری داستان، جو آخر میں کسی مذہبی حوالے کے بغیر عورت کی مظلومیت کو ظاہر کرتی ہے۔

۷۔انکل انیس: خواتین کے حقوق کے سلسلے میں نام نہاد این جی اوز کے کردار کو ظاہر کرتی ہوئی ایک سیدھی سادی معاشرتی کہانی۔

۸۔بھید: صوفیانہ اسرار کی کہانی۔

۹۔۲۷۵۰ سال بعد: ایک صدیوں پرانی کہانی کا نئے سرے سے آج پر انطباق۔

۱۰۔اعتراف: جنسی نفسیات کی کہانی۔

۱۱۔بابا جمالی شاہ کا جلال: ایک ملنگ بابا کے جلال کی انوکھی کہانی۔

۱۲۔مسکراہٹ کا عکس: ایک نفسی تجربہ۔۔۔مزید تفصیل کے لئے دیکھیں ''پرانی تحریریں، نئے حالات'' کتاب ہذا صفحہ نمبر۔۔۔اسی کہانی کا ذکر ہے۔

دونوں مجموعوں کے بعد کے افسانے

۱۔کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار: جرمنی کی بہت ساری کہانیوں سے بھری کہانی
مطبوعہ ''جدید ادب'' جرمنی۔شمارہ نمبر ۷ (جولائی تا دسمبر ۲۰۰۶ء)

۲۔اپنے وقت سے تھوڑا پہلے: حقیقت اور اسرار کی سرحد کو جوڑتی ہوئی کہانی۔
مطبوعہ ''جدید ادب'' جرمنی۔شمارہ نمبر ۹ (جولائی تا دسمبر ۲۰۰۷ء)

۳۔نیک بندوں کی بستی: ظاہر پرست مذہبی لوگوں کے لئے نصیحت آموز کہانی۔
مطبوعہ ''جدید ادب'' جرمنی۔شمارہ نمبر ۱۴ (جنوری تا جون ۲۰۱۰ء)

۴۔کار اور شیرینی: انسانی جنسی نفسیات کی کہانی۔
مطبوعہ ''شعر و سخن''، مانسہرہ۔شمارہ: ۹۰۔۹۱۔۔افسانہ نمبر، اپریل تا ستمبر ۲۰۲۲ء

۵۔کہانی کی کہانی: جسم اور روح سے لپٹی بھید بھری کائنات میں حقیقت و مجاز کے اتصال کی کہانی۔
مطبوعہ ''شعر و سخن'' مانسہرہ۔شمارہ: ۹۵۔۹۶ جولائی تا دسمبر ۲۰۲۳ء

☆☆☆☆

انتخاب:کلثوم رقیّہ

حیدرقریشی کے افسانوں کے اقتباسات

میں وہی ہوں کنواریاں جس کے لئے ہزاروں برسوں سے انتظار کر رہی تھیں۔
اور میں وہی ہوں۔۔چاند سورج اور ستارے جس کے آگے سجدہ ریز ہوں گے۔
اور میں وہی ہوں جو اپنے باپ کے تخت کا حقیقی وارث ہے۔
میں سوتیلے جذبوں کا شکار ہوں۔
میرے سوتیلے عزیز تاریخ کو جتنا مسخ کر لیں مگر وہ میرے باپ کا نام کیوں کر مٹا سکیں گے کہ پھر وہ خود بھی بے شناخت ہو جائیں گے۔
میں ابراہیم کا بیٹا ہوں۔
میں ابراہیم کا پوتا ہوں۔
میں آلِ ابراہیم سے ہوں۔
آگ ابراہیم کے لئے گلزار ہو گئی تھی تو مجھے کیونکر نقصان پہنچا سکے گی۔
”آگ سے ہمیں مت ڈراؤ یہ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی بھی غلام ہے۔“

میں انتظار کرتا ہوں!

وہ خوف سے چلّایا: ”پانی....!“
پہلے درویش نے جلدی سے پانی کا کوزہ اس کے منہ سے لگا دیا۔

گلاب کا پودا کچھ اور پھیل گیا اس کے سبز پتوں میں ایک اور سرخ پتہ ابھر آیا۔
تیسرے درویش نے خوفزدہ آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور دم توڑ دیا۔
باقی دونوں درویشوں نے دیکھا کے بے انت پھیلے ہوئی صحرا نے خود کو آدھا سمیٹ لیا ہے، رات کا تیسرا پہر گزر چکا تھا۔

گلاب شہزادے کی کہانی

میں ہی پنوں تھا اور میں ہی مجنوں تھا، میں ہی فرہاد تھا اور میں ہی رانجھا تھا، میں ہی کرشن تھا اور میں ہی مہندرا تھا.....میں ہر روپ میں تمہیں ڈھونڈتا تھا اور تمہارے جتنے بھی نام تھے سسّی، لیلیٰ، شیریں، ہیر، رادھا۔مومل سب ایک تھے اور میرے بھی جتنے نام ہیں سب ایک ہیں....لیکن ہم صدیوں سے ایک دوسرے کی تلاش اور جستجو میں حصے بخرے ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ہمارے ہر حصے میں دکھ کی ایک کہانی بنتی چلی جا رہی ہے۔۔۔۔۔“

غریب بادشاہ

میں ان خواتین کی طرف دیکھتا ہوں۔ان میں سے ایک بے حد خوبصورت عورت مجھے بڑے غور سے دیکھ رہی ہے۔مجھے عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔اس کی نگاہوں سے سورج کی کرنیں میری جسم پر اترنے لگتی ہیں اور میں جیسے ایک دم جوان ہونے لگتا ہوں۔پانچ سے دس، دس سے پندرہ، پندرہ سے بیس اور بیس سے پچیس۔اب میں پچیس سال کا بھرپور جوان ہو گیا ہوں۔مگر گاڑی کا سارا منظر بدل چکا ہے۔

دھند کا سفر

عشق کے روایتی قصوں میں ایسے واقعات ضرور ملتے ہیں مگر رات کو کسی سے چوری چھپے ملنے جانا میری زندگی کا پہلا تجربہ ہے۔گہری سیاہ رات میں پکڑے جانے کا کوئی خوف نہیں لیکن جب میں اس کے دروازے پر ہلکی سی دستک دینے لگتا ہوں تو اچانک روشنی میں نہا جاتا ہوں۔مجھے لگتا ہے سارا شہر میرے تعاقب میں نکل آیا ہے اور میں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہوں۔میں گھبرا کر چاروں طرف دیکھتا ہوں۔میرے چاروں طرف گھور اندھیرا ہے، پھر میں کس روشنی میں نہا گیا ہوں؟

کہیں یہ مرے اندر کی روشنی تو نہیں؟....مرے شجرے کی روشنی؟

آپ بیتی

''میں ماسوائے اللہ سے زائد ہوگیا پھر جب میں نے اپنے آپ کو بلایا تو حق تعالیٰ سے آواز آئی میں نے خیال کیا کہ اب میں خلقت سے آگے بڑھ گیا ہوں ۔۔۔۔میں لبیک اللھم لبیک کہتے ہوئے محرم ہوگیا پھر تسبیح کرنے لگا اور وحدانیت میں جب طواف کرنے لگا تو بیت المعمور نے میری زیارت کی، کعبہ نے میری تسبیح پڑھی، ملائکہ نے میری تعریف کی۔ پھر ایک نور نمودار ہوا جس میں حق تعالیٰ کا مقام تھا۔ جب اس مقام میں پہنچا تو میری ملکیت میں کوئی بھی چیز نہ رہی۔''

ایک کافر کہانی

ایک دفعہ میں اپنے وقت سے پچاس برس پہلے آیا تھا اور جب پچاس برس بعد میں دوبارہ آیا تھا تو میں نے یہ دیکھا تھا کہ میں اپنے وقت سے ایک صدی پہلے آ گیا ہوں....پھر جب میں ایک صدی بعد آیا تو میری آمد اپنے وقت سے دوسو سال پہلے تھی۔اور جب میں دوسو سال بعد آیا تو میری آمد میں چارسو سال رہتے تھے اور پھر جب میں چارسو سال بعد آیا تو میں اپنے وقت سے آٹھ سو سال پہلے آیا ہوا تھا۔اور اب جب میں آٹھ سو سال بعد آیا ہوں تو مجھے یقین ہوگیا ہے کہ میں اپنے وقت سے سولہ سو سال پہلے آ گیا ہوں۔

میں جو روشنی کی بشارت ہوں۔ ہر لحظہ اس دنیا سے دور ہورہا ہوں وہ کون سی صفر مدّت ہے۔جس میں یہ تمام صدیاں اور زمانے سمٹ آئیں گے اور میری آمد قبل از وقت نہ ہوگی۔

روشنی کی بشارت

امی ابو کو ''باؤجی'' کہا کرتی تھیں۔ میں نے بھی ایک بار ریڈیو کے ابو کو ''باؤجی'' کہا تھا مگر اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے.... میرے سوچتے سوچتے کتنے برسوں کا فاصلہ

طے ہوگیا ہے۔ آئینے میں اب امی کے خوبصورت اور جوان چہرے کی جگہ نحیف ولاغر چہرے نے لے لی ہے، مگر ٹی بی زدہ امی بھی مسکرا رہی ہیں۔

''امی آپ نے دکھ کے لمحوں کی ہر سانس میں ابو کا ساتھ دیا تھا پھر اب خوشی کے لمحوں میں کیوں منہ موڑ گئی ہیں؟''

''بیٹی! اسے مقدر کہتے ہیں' امی بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیتی ہیں۔

''امی اگر اسے مقدر کہتے ہیں تو پھر ظلم کسے کہتے ہیں؟''

''مقدر کے آگے ہر کوئی بے بس ہوتا ہے بیٹی!''

''میں ایسے ڈراؤنے مقدر کی آنکھیں پھوڑ دوں گی'' میں چیخ اٹھتی ہوں اور اس کے ساتھ ہی بے دم ہوکر نیچے گر جاتی ہوں۔

مامتا

ـ''شاید میں آپ لوگوں کی بحث کو کسی حتمی نتیجے تک پہنچا سکوں!'' اجنبی پرخلوص لہجہ میں کہتا ہے۔

''ہماری بحث کا موضوع جنت بدر ہونے کا سبب یعنی گندم ہے'' میں وضاحت کرتا ہوں۔

''کیا واقعی تمہیں جنت بدر کرنے کا سبب گندم ہی ہے؟''

''مجھے یاد تو کچھ ایسے ہی پڑتا ہے'' میں ذہن پر زور دیتے ہوئے بتاتا ہوں۔

''مولوی صاحبان بھی یہی بتاتے ہیں' وہ میرے موقف کی تائید کرتی ہے۔

''مجھے شک پڑتا ہے آپ نے گندم کی بجائے اس کا بھوسہ کھا لیا ہوگا''

اجنبی کی اس بات پر ہم احمقوں کی طرح ہنستے ہیں۔

اندھی روشنی

میں کسی تھکے ہارے، افسردہ شہزادے کی طرح ایک خوبصورت ڈیپارٹمنٹل سٹور میں داخل ہوتا ہوں۔مگر ایک دم گھبرا کے پیچھے پلٹنے لگتا ہوں۔سامنے کوئی وحشت زدہ آدمی کھڑا ہے۔ میں

پیچھے ہٹتے ہوئے پھر رک جاتا ہوں۔ سامنے تو بڑا ساقد آدم آئینہ نصب ہے۔

''تو کیا.....؟ کیا.....یہ.....میں ہوں؟''

میں خود کو پہچاننے سے انکار کر دیتا ہوں۔ مگر بالآخر مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ میں ہی ہوں۔ اپنی پہچان کو تسلیم کرتے ہی مجھے پہلی دفعہ اپنی برہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اسی اثنا میں آئینے میں مجھے بالکل اپنے ہی جیسی ایک وحشت زدہ عورت نظر آتی ہے۔ میں تیزی سے پلٹتا ہوں۔

حوا کی تلاش

مجھے عجیب سی بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ بے چارگی اور مایوسی کے اندھیرے چاروں طرف رقص کر رہے ہیں ۔ یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے میرے اندر والے فنکار کو قتل کر دیا ہے اور میں اپنی لامتناہی تلاش کے سفر میں ایک ایسے ٹیلے پر کھڑا ہوں جس کے ایک طرف سر بفلک دشوار گزار پہاڑ ہیں اور دوسری طرف گہرا ناقابل عبور سمندر۔ ایک طرف سینکڑوں اژدھوں اور عفریتوں کی پھنکاریں ہیں تو دوسری طرف آبی بلاؤں کی چیخیں۔ میں اپنے آپ کو پکارنا چاہتا ہوں مگر میری صدا بھی کہیں کھو گئی ہے۔

اپنی تجرید کے کشف کا عذاب

مجھے اس قطرے کی بے بسی پر رحم آنے لگا۔ میں خود کو ہواؤں کے ساتھ اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے تقدیر کو خشکی کے راستے سے بھی شکست دی۔ پانی کے راستے سے بھی شکست دی۔ اور اب آسمان کے راستے سے بھی میں نے اسے شکست دے دی تھی۔۔۔۔۔ میں اپنی عظمت کو خود ہی حیرت سے دیکھنے لگا!

بے ترتیب زندگی کے چند ادھورے صفحے

یہ بھی جادو کے کھیل ہیں، قسمت کے کھیل ہیں.....ہم جو زندہ ہیں کیا واقعی ہم زندہ ہیں؟''

وہ میرے بے حد قریب آجاتی ہے اور میں گھبرا کر آنکھیں نیچی کر لیتا ہوں۔ وہ کہے جا رہی ہے:

''کیا واقعی ہم زندہ ہیں؟۔۔نہیں۔۔ہم بھی قسمت کے جادوئی پنکھے کی ہوا کی زد میں آئے ہوئے مردہ کیڑے ہیں۔ جو صرف ہوا کے دباؤ سے متحرک ہو کر زندہ معلوم پڑتے ہیں۔''

پتھر ہوتے وجود کا دکھ

'دادا ابو اور کیا ہوتا تھا آپ کے زمانے میں؟' اس بار میرے پوتے کے لہجے میں شرارت کی چمک تھی۔ میں نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر بتانے لگا 'اُس زمانے میں ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، فیکس، کمپیوٹر....'

'دادا ابو! یہ ریڈیو کیا ہوتا تھا؟'

'یہ ایک چھوٹا سا بکس ہوتا تھا۔ اس کے بٹن گھمانے سے کبھی گیت سنائی دیتے۔ کبھی ساری دنیا کی خبریں، کبھی لوگوں کی گفتگو۔'

'اور ٹیلی ویژن ؟'

'ریڈیو والی ساری چیزیں ٹیلی ویژن پر سنائی بھی دیتی تھیں اور دکھائی بھی دیتی تھی۔ یعنی اگر کوئی آواز آ رہی ہے تو اس کا چہرہ بھی دکھائی دیتا اور وہ شخص ہماری طرح ہی چلتا پھرتا اور بولتا نظر آتا تھا'

ننھے منے معصوم بچوں نے میری بات سن کر اتنے زور سے قہقہے لگائے کہ میں خفیف سا ہو گیا۔ وہ مجھ سے پہلے زمانے کی اور دلچسپ باتیں سننا چاہتے ہیں مگر میں کہتا ہوں۔ پیارے بچو! میں اب تھک گیا ہوں اس لیے باقی باتیں کل سناؤں گا۔

پھر میں ان کے جھونپڑے سے نکل آتا ہوں۔ جھونپڑے سے باہر آ کر یونہی خیال آیا اور میں رُک کر بچوں کی آوازیں سننے لگا۔ میرا ایک پوتا کہہ رہا تھا: 'دادا ابو زیادہ بوڑھے ہو گئے ہیں اس لئے اچھی اچھی کہانیوں کو اپنے زمانے کے واقعات سمجھنے لگ گئے ہیں۔'

میرے باقی سارے پوتے پوتیاں اس کے تبصرے کی تائید میں ہنس رہے تھے''

کاکروچ

''پیرسائیں!اس بھول بھلیاں سے نکلنے کی کیا صورت ہے؟''
مجھے بھی مجذوب فقیر سے کچھ خوف محسوس ہونے لگا۔
''توحیدِ خداوندی پہ کامل ایمان'، پیرسائیں نے مجذوب فقیر کو دیکھ کرتھوک نگلتے ہوئے کہا۔
''تو پھر مجھے توحید کا بھید سمجھا دیں''

''توحید کا بھید!''پیرسائیں کی آواز لرزی''تم نے سنا نہیں۔جو توحید کے بارے میں سوال کرتا ہے وہ جاہل ہے۔اور جو کوئی جواب دے کر اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے وہ مشرک ہے کیونکہ'بے مثال' کے بارے میں بتانے کے لئے اسے کسی مثال کا سہارا لینا پڑے گا'' پیرسائیں کی لرزتی آواز اب جوش سے بھرنے لگی تھی۔''اور جو توحید کی معرفت کا دعویٰ کرے وہ ملحد ہے کیونکہ خدا لامحدود ہے اس لئے اس کا عرفان کبھی مکمل ہو ہی نہیں سکتا اور۔جو توحید کو نہ سمجھے وہ کافر ہے''

روشن نقطہ

آج شاہ جی نے ایک پیر جی کا احوال سنا کر حیران کر دیا۔شاہ جی اُن پیر جی سے بے حد متاثر نظر آ رہے تھے۔کہنے لگے:
''میں نے پیر جی سے پوچھا یہ آپ نے اتنا بڑا مزار کیوں بنا رکھا ہے؟
میری بات سن کر مسکرائے اور بولے''یہ تو صرف لوگوں کو جمع کرنے کا بہانہ ہے کیونکہ من حیث القوم ہم مردہ پرست ہیں۔زندوں کو مار ڈالتے ہیں اور مرے ہوؤں پر پھول چڑھاتے ہیں۔بس اسی وجہ سے مزار بنوانا پڑا۔''
میں پیر جی کی صاف گوئی سے بڑا متاثر ہوا۔پھر ان کے علم کا اندازہ لگانے کے لئے ان سے الم کے معنی پوچھے۔انہوں نے مجھے ششدر کر دیا ۔
''یہ نفس کی تین حالتوں کا بیان ہے۔امارہ۔لوّامہ۔مطمئنہ''
پیر جی نے علم و معرفت کی اتنی بڑی بات ہلکے پھلکے انداز میں بیان کر دی۔میں تب سے اب تک

اسی عارفانہ سرور میں بھیگا ہوا ہوں''
شاہ جی کی پیر جی سے ملاقات کی روداد نے مجھے بھی مسحور کر دیا۔

دو کہانیوں کی ایک کہانی

اس نے بتایا کہ وہ دریا کے دوسری طرف والے شہر کا باسی ہے اور ایک چھوٹے سے پُل سے واقف ہے جہاں سے پیدل دریا پار کیا جا سکتا ہے۔وہ بغیر سوچے سمجھے اس شخص کے ساتھ چل پڑا۔یہ بمشکل دو فٹ چوڑا پُل تھا جس کے ایک طرف لوہے کے پائپوں کا جنگلہ سا بنا تھا اور دوسری طرف سے بغیر جنگلے کے تھا۔اس نے آدھا پُل بے خیالی میں پار کر لیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ تو پُل صراط پر چل رہا ہے۔اس نے جنگلے کو پکڑے ہوئے اوپر دیکھا۔ریلوے لائن والے پُل پر چندھیا دینے والی روشنی تھی۔وہاں مزدور کام کر رہے تھے۔اس نے چندھیائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ نیچے نظر دوڑائی تو گرمیوں کا چڑھتا ہوا دریا تھا۔اس کا دل بیٹھنے لگا۔تب اسے جتنی دعائیں یاد تھیں اس نے ان کا وِرد شروع کر دیا ان میں علم میں اضافے سے لے کر والدین کی مغفرت تک کی کئی غیر متعلق دعائیں بھی شامل تھیں۔نہ وہ اوپر دیکھ سکتا تھا نہ نیچے۔تب اس نے اپنے آگے والے ہم سفر کو دیکھا تو وہ غائب تھا۔خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔وہ کون تھا اور کیوں مجھے یہاں تک لا کر غائب ہو گیا۔دریا کے دوسری طرف والے شہر کے رہنے والے نے مجھے دھوکہ کیوں دیا؟ان خیالوں اور سوالوں کے ساتھ اس نے بے بسی سے آسمان کی طرف نظر اُٹھائی۔ایک طرف گہری تاریکی تھی اور ایک طرف ٹرین کے پُل پر ہونے والی تیز روشنی۔گھبراہٹ میں اس کا ایک ہاتھ جنگلے سے ہٹ گیا۔اس نے نیچے کی طرف دیکھا جہاں دریا کا چڑھتا ہوا پانی تھا،اضطراری طور پر اس کا دوسرا ہاتھ بھی جنگلے سے ہٹ گیا۔اس کے قدم لڑکھڑائے تھے۔پھر اسے وہی آواز سنائی دینے لگی:
چھلانگ لگا دو.....نیچے چھلانگ لگا دو۔پھر دریا میں گہری چھپاک کی آواز اس نے خود ہی سنی تھی۔

اس کے بعد اسے ایسا لگا جیسے اس کی ماں اسے نہلا رہی ہے۔اس نے اس کے منہ پر صابن مَل دیا ہے۔بھائی نے نلکے کی ہتھی تیز چلانی شرع کر دی ہے۔گھبرا کر وہ تھوڑا سا تڑپا تو ماں نے

بے تاب ہو کر اسے سینے سے لگا لیا۔اس کی ساری گھبراہٹ دور ہو چکی تھی۔

گھٹن کا احساس

میں نے ڈرتے ڈرتے کنڈی کھولی تو نئی چوہدرانی سامنے کھڑی تھیں۔ان کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔انہوں نے قہر بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور ''نمک حرام'' کہہ کر بیڈ روم کا دروازہ زور سے اندر سے بند کر لیا۔

بتائیے بھلا میں نے نمک حرامی کہاں کی ہے۔خدا کی قسم میں نمک حرام نہیں ہوں۔ چوہدری اللہ دتہ صاحب کل رات کے کہیں گئے ابھی تک واپس نہیں آئے۔وہ آجاتے تو وہ خود گواہی دیتے کہ بھولا اور سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن نمک حرام نہیں ہو سکتا۔ پر یہ چوہدری اللہ دتہ صاحب کل رات سے اچانک کہاں چلے گئے ہیں اور ابھی تک واپس کیوں نہیں آئے؟

اور وہ بیڈ روم کی کنڈی باہر سے کس نے لگائی تھی؟

رب جانے یہ کیا چکر ہے!

بھولے کی پریشانی

تکلیف اور اذیت کے عالم میں ''لے کے رہیں گے پاکستان''،''جئے ہند'' اور ''ست سری اکال'' کے سارے نعرے بھی اسے ریپ کرتے رہے اور اسے اس کا نیا نام یاد کراتے رہے۔وہ چیخی چلائی تو لیڈر سکھ نے دھمکی دی کہ اگر وہ درست نہ ہوئی تو وہ اپنے گروہ کے باقی سات جوانوں کو بھی اندر مدعو کر لے گا۔تب وہ نہایت بے بسی کے ساتھ سسک پڑی اور درست ہو گئی اور اسے یقین آ گیا کہ اس کا نام رشیدہ نہیں پرکاش کور ہے اور پھر وہ سچ مچ پرکاش کور بن گئی۔لیڈر سکھ سریندر سنگھ کی بیوی!

اس کے اندر کی رشیدہ کبھی اس سے گزرے ہوئے، بھوگے ہوئے اور سنے ہوئے واقعات کی کوئی بات کرتی تو وہ اسے سختی سے ڈانٹ دیتی۔کسی نعرے کا مطلب پوچھتی تو اسے ٹوک دیتی۔سکھوں کے دور میں مسلمانوں کی اذانوں پر پابندی کی بات ہو یا مغلیہ دور میں گورو گوبند سنگھ

جی کے بچوں کے قتل کا واقعہ، پاکستان کا مطلب لا الٰہ الا اللہ ہو یا پلیدستان۔وہ تو اپنا مطلب، اپنے معانی گم کر بیٹھی تھی۔اس کے لئے اب ہر چیز بے معنی تھی۔

شناخت

ہماری دنیا، سارے معاشرے، سارے فرقے، سب کے نزدیک مجرم وہی ہے جو پکڑا جائے۔جو مہارت کے ساتھ جی بھر کر گناہ کرے، جرائم کا مرتکب ہو لیکن پکڑا نہ جائے وہ متقی، پرہیزگار اور مومن ہے۔بارہا یہ خیال آئے کہ انور صاحب کو جا کر ان کی بیگم کے کرتوت بتا دوں، پھر سوچتا چلو انور صاحب پر ایک قیامت تو گزر چکی اب انہیں ایک اور قیامت سے کیوں دوچار کروں۔جیسی بھی سہی ان کی زندگی گزر تو رہی ہے، گھر بسا تو ہوا ہے۔آخر میں نے راز افشا کرنے کی بجائے پردہ پوشی کرنے کو ترجیح دی۔

انکل انیس

میں وہ اوڈیس (Odysseus) ہوں جسے کوئی ہومر نصیب نہیں اس لیے مجھے اپنے کردار کے علاوہ ہومر کے حصے کا کام بھی خود کرنا ہے۔کئی صدیوں کے بعد جب تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرانے لگی ہے تو سب کچھ عین اسی طرح نہیں ہے جیسا پہلے تھا۔تاہم تاریخ کے مرکزی کردار تھوڑے بہت فرق کے ساتھ بڑی حد پہلے جیسے ہیں۔واقعات کی نوعیت میں بعض بنیادی تبدیلیاں آئی ہیں اس کے باوجود واقعات کا انجام بہر حال پہلے سے کہیں بہتر ہونے کی امید ہے۔

۲۷۵۰ سال بعد

میرے بچپن میں ہی میرے ابا جی نے ایک طرح سے میرے دل میں اس کا شوق پیدا کیا تھا۔وہ مجھے قصّے، کہانیاں سنانے کی بجائے بزرگانِ دین کے حالات و واقعات دلچسپ پیرائے میں سناتے۔ایسے واقعات میں بہت سی باتیں میری سمجھ میں تو نہیں آتی تھیں لیکن انہیں سننے میں انوکھا سا مزہ ضرور آتا تھا۔ایک دفعہ ابا جی نے اپنے مرشد کی جڑواں بہن کے بچپن کا ایک دلچسپ اور حیرت انگیز واقعہ سنایا:

''جنت بی بی بڑی اللہ والی تھی۔بچپن میں ایک دفعہ اس نے خواب دیکھا کہ وہ سمندر کے کنارے کھڑی ہے۔سمندر کی لہریں اس کی ٹانگوں تک آ آ کر لوٹ جاتی ہیں۔ بیدار ہونے پر جنت بی بی نے اپنی ماں کو اپنا خواب سنایا۔ ماں اس خواب کو سن کر بے حد حیران ہوئی کیونکہ جنت بی بی کی شلوار بھی گیلی تھی۔''

میں نے ابا جی کی بات سن کر بچپنے کی معصومانہ ہنسی کے ساتھ کہا: ''نیند میں ان کی پشی نکل گئی ہوگی۔''

ابا جی میری بات سن کر بے ساختہ مسکرا دیئے۔ پھر انہوں نے وضاحت کی کہ جنت بی بی کی شلوار صرف گیلی ہی نہیں تھی۔ اس پر سمندر کی ریت بھی چپکی ہوئی تھی۔ اس واقعہ کی پراسراریت نے میرے دل میں یہ شوق پیدا کیا کہ میرے ساتھ بھی اس سے ملتا جلتا کوئی واقعہ پیش آئے۔ بڑا ہوا تو کئی کہانیوں میں اس انداز کے فرضی قصے پڑھے لیکن میری خواہش تو ذاتی تجربے کی تھی۔

بھید

صاحبان!۔۔۔اس وقت میں اسی برس سے اوپر کا ہو گیا ہوں۔اب اس عمر میں کہاں تک جھوٹ بولوں لیجئے آپ کو سچی بات بتا ہی دوں۔حمید نامی کوئی شخص کبھی بھی میرا دوست نہیں رہا۔میرے اندر ساٹھ سال تک تو بہرحال جنس کا طوفان سا مچا رہا لیکن یہ طوفان کبھی بھی کناروں سے باہر نہیں آیا۔میری فطرتی بزدلی نے میرے کناروں کو بہت بڑے بند میں تبدیل کر دیا تھا۔میری جنسی فتوحات کی ساری کہانیاں میری خواہشات کا لفظی بیان تھیں اور بس۔اس لفظی بیان کی جادوگری کام کرتی رہی۔ مجھے بزدل کہنے والے مجھے حسد بھری نظروں سے دیکھتے اور جل کر من ہی من میں کہہ دیتے ہونہہ یہ تو مکھی بھی نہیں مار سکتا۔اب وہ سارے دوست مرکھپ چکے ہیں تو پھر مزید جھوٹ بولنے سے فائدہ؟ یوں بھی جنس کا طوفان تو کبھی کا ختم ہو چکا ہے۔اب تو میرے اندر اور باہر برف ہی برف ہے۔(پر یہ ''خواہش'' ابھی تک کیوں نہیں مری؟)

ابھی ابھی ایک انوکھی بات ہو گئی ہے۔ ہلکی سی دھپ کی آواز کے ساتھ دو جُڑی ہوئی مکھیاں میرے میز پر آن گری ہیں۔ان کے ''طرزِ عمل'' سے مجھے علم ہو گیا ہے کہ ایک نر ہے اور ایک مادہ۔

میں نے کسی وحشت یا کراہت کے بغیر انہیں دلچسپی سے دیکھا ہے۔

کاش میرے سارے بچپن کے دوست اس وقت زندہ ہوتے اور یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔

میں نے اخبار اٹھا کر اسے تھوڑا سا فولڈ کیا ہے اور اس کے ایک ہی وار سے نر اور مادہ دونوں مکھیوں کو ''دورانِ عمل'' ہی ختم کر دیا ہے۔

اعتراف

لڑکوں نے ایک شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ بابا جمالی شاہ سے کہا کہ یہ ایک میّت ہے اس کی نماز جنازہ پڑھا دیں۔ بابا نے نماز جنازہ پڑھانی شروع کر دی حالانکہ پیچھے کوئی صف بھی نہیں بنی تھی، نہ ہی کوئی اور نماز جنازہ میں شریک تھا، بابا جمالی اکیلے ہی لگے ہوئے تھے، جب انہوں نے آخری سلام پھیرا تو لڑکوں نے زور زور سے قہقہے لگانے شروع کر دیئے اور کہنے لگے: بابا جمالی! یہ تو مولانا عطاءالرحیم کا بیٹا جیلا ہے اور زندہ ہے۔تب بابا جمالی شاہ نے بڑے جلالی انداز میں کہا:

یہ جو کوئی بھی تھا اب صرف قیامت کے دن ہی اٹھے گا کیونکہ اس کا جنازہ جمالی شاہ نے پڑھا دیا ہے۔

تمام حاضرین پر سکتہ طاری ہو گیا۔ جیلا واقعی مر چکا تھا۔

☆☆

جو کچھ جیلے ساتھ ہو گیا ہے کاش ایسا نہ ہوا ہوتا!

لیکن اس کی ساری ذمہ داری خود اُس پر اُس کے سخت دل مولوی باپ پر ہی عائد ہوتی ہے۔

بابا جمالی شاہ کا جلال

دراصل ہمارے اندر کی دنیا میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا ہے وہ اندر ہی اندر ہوتا ہے۔ باہر کی، ظاہر کی دنیا سے یہ سب کچھ الگ تھلگ ہوتا ہے۔اپنے اندر کی دنیا میں مگن رہنے کے باوجود میں اندر اور باہر کی دنیاؤں کے اس فرق کو بخوبی سمجھتا ہوں۔ابا جی کی تصویر سے میرے تعلق کی نوعیت بھی حقیقتاً داخلی تھی۔ ظاہر کی دنیا کے حساب سے تو شاید ایسا کچھ بھی نہیں تھا لیکن میں نے ڈبڈبائی

آنکھوں سے بھی پوری طرح دیکھا تھا کہ اباجی سچ مچ تصویر کے فریم سے باہر نکلے، اور صوفے پر آ کر میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ انہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ اپنی پگڑی کی لڑ سے میرے آنسو صاف کئے۔ لیکن آنسو تو امڈتے ہی چلے آتے تھے۔ جیسے سیلاب بن کر خواہشوں کے اژدہام کو بہالے جانا چاہتے تھے۔ تب اباجی نے بیٹھے ہی بیٹھے مجھے اپنی بانہوں میں بھر کر بھینچ لیا۔ شاید وہ بول نہیں سکتے تھے اور اسی طرح مجھے دلاسہ دے رہے تھے۔ پگڑی کی لڑ سے میرے آنسو صاف کئے جانے اور اباجی کا مجھے خود سے لپٹانے کا میرا تجربہ خیالی یا روحانی قطعاً نہیں تھا۔ یہ مکمل طور پر جسمانی اور ظاہری وقوعہ تھا۔

مسکراہٹ کا عکس

کہانی کار جس کہانی کے تعاقب میں تھا وہ دراصل ایٹمی جنگ کے بعد کی فضا کے موضوع سے متعلق تھی۔ ایٹمی جنگ کے بعد چند انسان روئے زمین پر کسی طرح بچ گئے تھے اور بدقسمتی سے وہ سب الگ الگ مذاہب اور الگ الگ فرقوں کے لوگ تھے۔ پانی کے عظیم طوفان، طوفانِ نوح میں اچھے اچھے جوڑوں کو کشتی میں محفوظ کرکے بچالیا گیا تھا تاکہ دنیا کو اس کے گناہوں کی سزا دینے کے بعد پھر سے زندگی سے لبریز کیا جاسکے۔ لیکن یہ کہانی جو کہانی کار کے قابو میں نہیں آرہی، اس میں پانی کے طوفان سے زیادہ بڑا اور ہولناک ایٹمی طوفان آچکا ہے۔ اتنی ترقی یافتہ اور ہنستی بستی دنیا پتھر کے زمانے میں چلی گئی ہے لیکن پتھر کے زمانے جیسی بے خبری سے بھی محروم ہوچکی ہے۔ پہلے پہل زندہ بچنے والے ایک فرقے کے فرد نے جب دیکھا کہ وہ زندہ بچ گیا ہے تو اُس نے اسے اپنے مسلک کی سچائی قرار دے کر خود کو خدا کا پسندیدہ بندہ سمجھ لیا۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ ایسے کتنے ہی ’’خدا کے پسندیدہ بندے‘‘ بچ گئے ہیں اور وہ سب کے سب متحارب مذاہب اور فرقوں کے افراد ہیں تو پھر ان سب کے درمیان مذہبی مخاصمت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سب ہی خدا کے نیک بندے ہیں اور سب ہی ایک دوسرے کی تکفیر وتکذیب کرکے اپنی صداقت کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں۔ اتنے بڑے پیمانے پر ہوجانے والی انسانی تباہی اور ساری دنیاوی ترقیات کے خاتمہ کی بھی ان لوگوں کو

پرواہ نہیں ہے اور اب بھی یہ سارے بچے کھچے مذہبی لوگ ایک دوسرے کے خلاف اپنا اپنا زہر اگل رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی تکفیر وتکذیب کررہے ہیں۔

کہانی کار جو ہمیشہ سے اس دھرتی پر انسانوں کے کے رہنے کی تمنا کیا کرتا تھا، اس منظر پر حیرت زدہ ہے اور سارے فرقہ پرستوں کی پرانی متعصّبانہ روش سے تنگ آکر دھرتی سے انسانوں کے مکمل خاتمہ کی دعا کرنا چاہتا ہے لیکن اسے سمجھ نہیں آرہی کہ کہانی کو کیسے مکمل کرے۔ کیا بددعا پر کہانی کو ختم کیا جائے یا پھر کوئی آسمانی آفت لاکر سارے بچے کھچے متعصب انسانوں کو ختم کیا جائے۔ اگر آسمانی آفت لائی جائے تو کیسی ہو؟ کہانی کار ابھی تک اس مسئلے میں الجھا ہوا ہے اور کہانی اسی وجہ سے اس کے قابو میں نہیں آرہی۔

کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار

ایک بار ایک مجذوب فقیر اس گاؤں میں آ گیا۔ بستی کے لڑکوں، بالوں نے اس مجذوب سے باتیں کیں تو انہیں لگا کہ ان کے خدا کے محدود تصور کے برعکس اس مجذوب کی باتوں میں ایک ایسے خدا کا احساس ملتا ہے جو سچ مچ لامحدود ہے اور جس کی محبت بھی دل دہلا دینے والی ہے۔

مجذوب نوجوانوں کو بتا رہا تھا کہ خدا خود کہتا ہے کہ جو مجھے ڈھونڈتا ہے، وہ مجھے پالیتا ہے۔ اور جو مجھے پالیتا ہے وہ مجھے دیکھ لیتا ہے۔ جو مجھے دیکھ لیتا ہے وہ میرا عاشق بن جاتا ہے۔ جو میرا عاشق ہوجاتا ہے، اُسے میں قتل کردیتا ہوں اور جسے میں قتل کردیتا ہوں، اُس کا خون بہا میں خود ہوجاتا ہوں۔

تب نیک بندوں کی اس بستی کی بڑی عبادت گاہ کا منتظم وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے مجذوب کی یہ بات سنی تو پہلے اسے بھی یہ بات بہت اچھی لگی لیکن پھر یکدم اسے خیال آیا کہ یہ تو اس کے پختہ عقائد اور ایمان سے ہٹ کر بات کی گئی ہے۔ صراطِ مستقیم سے ہٹی ہوئی بات کتنی ہی خوبصورت اور دل کو بھانے والی کیوں نہ ہو وہ سراسر گمراہی اور ضلالت ہے۔ چنانچہ اس نے اسی وقت بستی کے بہت سارے نیک بندوں کو جمع کرکے صلاح مشورہ کیا اور اپنی نئی نسل کو کسی بھی طرح

کی گمراہی اور ضلالت سے بچانے کے لیے فیصلہ کیا کہ یا تو یہ مجذوب نیک بندوں کی بستی کو چھوڑ دے یا پھر اسے قتل کر دیا جائے۔ فیصلہ بظاہر یہی تھا لیکن حقیقت میں یہ طے ہوا تھا کہ مجذوب کو قتل کر دیا جائے گا۔ اپنے فیصلے پر عملدرآمد کے لیے نیک بندوں کے سرپنچ مجذوب کے ٹھکانے پر پہنچے تو مجذوب غائب تھا۔ جیسے اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

نیک بندوں کی بستی

جو کچھ مجھ پر گزرا، یا میں نے محسوس کیا وہ سب کیا تھا؟ کیا میں نے کوئی کشفی نظارہ سا دیکھا تھا یا کسی روشنی نے مجھے اپنے وقت سے چند منٹ پہلے کا سفر کرا کے پھر واپس اپنے مقام پر چھوڑ دیا تھا؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ لیکن کچھ سمجھ آ بھی رہی تھی۔

کل رات والے نظارے یا تجربے کے بعد ساری رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آ سکی تھی اور آج جب میں جاب پر جانے لگا ہوں تو طبیعت کافی بوجھل ہے۔ گھر سے باہر نکلا تو گہرے بادل اور دھند ایک دوسرے میں مدغم دکھائی دیئے۔ ہیٹرس ہائم ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو ریلوے کے عملہ کی طرف سے اعلان ہو رہا تھا کہ ویزبادن سے فرینکفرٹ جانے والی ٹرین دس منٹ لیٹ آ رہی ہے۔ دھندلی فضا نے ریلوے اسٹیشن کی روشنیوں کو بھی مدھم کر رکھا ہے۔ اس دوران فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین اپنے ٹھیک وقت پر آ گئی اور میں اپنی عجیب سی عادت کے مطابق دیکھنے لگتا ہوں کہ شاید میرا بیٹا اس میں سے اُتر کر آ رہا ہو۔ فضا کی دھندلاہٹ کے باوجود واقعی میرا چھوٹا بیٹا انجن کے ساتھ والے ڈبے سے نیچے اُترا ہے اور میری طرف آ رہا ہے۔ میرے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی ہے۔ لیکن جیسے جیسے میرا بیٹا قریب آتا جا رہا ہے، میری مسکراہٹ، حیرت آمیز ہوتی جا رہی ہے۔ کیونکہ اب وہ میرا بیٹا نہیں لگ رہا بلکہ صاف طور پر دکھائی دے رہا ہے کہ میرے ابا جی میری طرف آ رہے ہیں۔ میں ابا جی کا استقبال کرنے کے لئے ان کی طرف آگے بڑھ کر جاتا ہوں۔ لیکن جب ان کے قریب پہنچتا ہوں تو میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ یہ تو میں خود ہوں!

میں اپنے آپ سے گلے مل رہا ہوں اور ایسے لگ رہا ہے کہ میں خود سے نہیں بلکہ اپنے سارے آباؤاجداد اور اپنی ساری موجودہ اور آنے والی نسلوں کو گلے مل رہا ہوں۔ اسی حالت میں دیکھتا ہوں کہ فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین آ رہی ہے۔ دور سے اس کی ہیڈ لائٹ کی چمک اسٹیشن کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔

مجھے رات والا واقعہ یاد آ جاتا ہے اور میں مزید کسی حیرت میں پڑے بغیر یقین کر لیتا ہوں کہ فرینکفرٹ سے آنے والی جو ٹرین کچھ دیر پہلے آ چکی تھی، وہ دراصل اب آ رہی ہے، ٹرین اسٹیشن پر رُک رہی ہے اور میں اس کے سب سے اگلے ڈبے میں سے اپنے اترنے کا انتظار کرنے لگتا ہوں!

اپنے وقت سے تھوڑا پہلے

ایک دن میں زیبرا کراسنگ پر رکا ہوا اپنے پیدل رستے کے سگنل کے کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی میرا اشارا کھلا، سڑک پر زیبرا کراسنگ کے قریب شیرنی کے لوگو والی وہی گاڑی آ کر رُکی۔ میں سیدھا دیکھنے کی بجائے اس کی طرف گردن موڑ کر اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور اسی حالت میں سڑک کراس کر رہا تھا۔ اسی حالت میں، میں نے دیکھا کہ شیرنی کے لوگو والی کار کی مالکن مجھے خونخوار نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سڑک پار کر کے میں رک گیا۔ پلٹ کر دیکھا تو وہ سگنل کھلتے ہی آگے کی طرف نکل گئی تھی۔ میں کچھ دیر تک وہاں یونہی کھڑا رہا اور پھر زیبرا کراسنگ کی طرف مڑ کر واپسی کا ارادہ کیا۔ مجھے اندازہ نہیں کہ میں کدھر جا رہا تھا۔ مجھے یہ بھی اندازہ نہیں ہے کہ ٹریفک سگنل کس طرف سرخ ہے اور کس طرف سبز ہے۔۔۔ میرا رستہ کھلا ہے یا نہیں۔۔۔ میں کچھ دیکھے بغیر چل پڑا، تب ہی دوسری طرف سے شیرنی کے لوگو والی وہی گاڑی ریورس میں آتی دکھائی دی۔ لیکن اب کبھی وہ شیرنی کے لوگو والی کار لگتی تھی اور کبھی سچ مچ کی شیرنی۔۔۔ جس کا چہرہ بالکل کار کی مالکن جیسا تھا۔ ایک قدم پر شیرنی اور ایک قدم پر کار ۔۔۔۔ اس کے دونوں روپ ادل بدل رہے تھے اور پھر مجھے پتہ نہیں چلا کہ کار کی ڈگی زور سے میرے جسم کے درمیانے حصے سے ٹکرائی تھی یا لوگو

والی شیرنی نے لوگو سے چھلانگ لگا کر مجھے اپنے جبڑوں میں دبوچ لیا تھا۔میرے جسم کا درمیانہ حصہ خون سے لت پت تھا،میں سڑک کے بیچ میں پڑا ہوا تھا۔میری جان نکل چکی تھی لیکن شاید تھوڑی سی باقی تھی۔

میں نے گھبراہٹ کے عالم میں اپنے خون میں لت پت حصے کو ہاتھ لگایا۔اور اطمینان کا سانس لیا۔

اللہ کا شکر ہے،وہ خون نہیں تھا۔

کار اور شیرنی

پہلا پیراگراف

یہ کہانی وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں اس کا اختتام ہوتا ہے۔فلیش بیک کی تیکنیک سے نہیں بلکہ سچ مچ وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں یہ ختم ہوتی ہے۔لیکن کیسے؟

کوئی بھی کہانی جب شروع ہوتی ہے تو سیدھ میں آگے بڑھنے لگتی ہے۔بے شک اس میں کچھ نشیب وفراز بھی آتے ہیں،کچھ موڑ بھی آتے ہیں،ٹیڑھے میڑھے رستوں سے بھی گزر ہوسکتا ہے،گلیوں،سڑکوں،شاہراہوں،فٹ پاتھوں سے پگڈنڈیوں تک کئی مقامات پیش آسکتے ہیں۔جنگلوں،دریاؤں،سمندروں اور صحراؤں سے بھی گزرنا پڑسکتا ہے۔لیکن ایسے ہر مقام سے گزرتے ہوئے بھی کہانی کو آگے بڑھنا ہوتا ہے۔یہ صراط مستقیم ہو یا زگ زیگ لیکن آگے تو چلنا ہوتا ہے۔پر یہ واضح نہیں ہو رہا کہ کہانی اپنے اختتام سے کیسے شروع ہو۔

آخری پیراگراف

تب میں نے کہانی کو بتایا کہ مرد ہو یا عورت،سارے انسان اپنی اصل میں ایک ہیں۔کوئی اپنی کھوج میں نکلے یا خدا کی جستجو میں نکلے۔کائنات کے کسی بھید کو سمجھنا چاہے یا اپنے اندر کے اسرار کو جاننا چاہے سب کا رخ ایک ہی طرف ہوجاتا ہے۔وہاں سارا اچھا،برا،گناہ ،ثواب،پاکیزگی ،ناپاکی،دیوانگی،دانش،جسم،روح،سب ہم آمیز ہو جاتے ہیں،اور جیسے سب

بے معنی ہوجاتے ہیں۔لیکن یہ تب ہوتا ہے جب آپ کا مرکزِ جستجو آپ کو نظر اٹھا کر دیکھتا ہے۔اسے نظرِ کرم کہیں یا محبوب کی نگاہ،بس ساری کائنات اور اس کے سارے اسرار اُس کی آنکھ کے اٹھنے پر منکشف ہوجاتے ہیں۔

میری تقریر ختم ہوئی تو کہانی کی کھنکتی ہنسی سے ماحول مترنم ہوگیا اور ساتھ ہی کہانی کی آواز آئی

میری طرف دیکھو!

میں نے کہانی کی طرف دیکھا،اُس کی خوبصورت غلافی آنکھیں اُٹھی ہوئی تھیں،وہ مجھے محبت سے دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھ سے ساری کائنات کے سارے اسرار منکشف ہوئے جا رہے تھے۔سارا اچھا،برا،گناہ،ثواب،پاکیزگی،ناپاکی،دیوانگی،دانش،جسم،روح،سب ہم آمیز ہوئے جا رہے تھے،سب بے معنی ہوئے جا رہے تھے۔جیسے از سرِ نو تخلیق کائنات ہونے لگی تھی۔

ایک دائرہ تھا جو مسلسل گھوم رہا تھا۔مثلث،چوکور،مستطیل،مربع سارے عقائد،تصورات،خیالات،سارے زمانے،زمینیں،اجسام،ارواح اور ان سب کی ضرورت کی ہر شے کی کلبلاہٹ اس دائرے کے اندر محسوس ہونے لگی تھی۔۔۔یہ ازل اور ابد کا عالم تھا جہاں لامحدود دائرہ مسلسل متحرک تھا،رقص فرما تھا،اپنا ہی طواف کر رہا تھا۔یہاں ساری سیدھیں دائرے کے اندر تھیں۔دائرہ خود بس دائرہ در دائرہ تھا۔جہاں جو کچھ اختتام پذیر تھا وہیں سے وہ شروع ہو رہا تھا۔دائرے کے اختتام اور شروع کا تعین کون کرسکتا ہے؟

کہانی میرے سامنے تھی،میں اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی غلافی آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔

کہانی میرے سامنے رقص کررہی تھی اور میں اس کے گرد طواف کررہا تھا۔

دائرہ در دائرہ ہوتے ہوئے لامحدود دائرے میں کہانی جہاں جہاں ختم ہورہی تھی وہیں وہیں شروع ہورہی تھی۔

کہانی کی کہانی

حیدرقریشی

پرانی تحریریں، نئے حالات اور مزید باتیں

میرے افسانوں پر کامران کاظمی نے اپنے ایم فل کورس ورک کا مختصر مقالہ ڈاکٹر رشید امجد کی نگرانی میں ۲۰۰۶ء میں لکھا تھا۔ یہ مقالہ کتاب کے طور پر چھپنے والا تھا لیکن پھر یہ سارے متعلقین کی اپنی اپنی مصروفیات یا ترجیحات میں گم ہو گیا۔اب کلثوم رقیّہ نے اس گم شدہ مقالے کو نہ صرف از سرِ نو دریافت کیا ہے بلکہ اس کی ترتیب و تدوین کر کے اسے شائع کرنے لگی ہیں۔ میرے لئے یہ بڑی خوشی کی خبر ہے۔ میں کلثوم رقیّہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

کلثوم رقیّہ نے میرے بعض افسانوں کے بارے میں چند سوال کئے تھے اور خاص طور پر میرے اب تک کے آخری افسانوں کو سمجھنے میں اپنی مشکل کا ذکر کیا تو مجھے مناسب لگا کہ اپنی افسانہ نگاری کے بارے میں کی گئی اپنی کچھ پرانی باتوں کو بھی دوبارہ بیان کر دوں اور کچھ نئی باتیں بھی اسی تناظر میں کر دوں۔

اقتباس

''اس سارے مطالعہ سے گزرتے ہوئے مجھے اپنی لکھی ہوئی کئی پرانی تحریریں نئے حالات کے تناظر میں بہت ہی تازہ دکھائی دیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے بیس پچیس سال پہلے کی تحریریں وجدان کی کسی ان جانی سطح سے لکھی گئی تھیں۔اس کے لئے مجھے تخلیقات میں سے متعدد مثالیں ملی ہیں یہاں صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

اس وقت ساری اسلامی دنیا عمومی طور پر اور پاکستان خصوصی طور جس قسم کے حالات سے دو

چار ہے۔اندرونی اور بیرونی دونوں طور پر حالات اتنے تکلیف دہ ہیں کہ ایسے لگتا ہے ہمارے لئے کوئی راہِ نجات نہیں رہی۔اس صورتحال کو میرے ۱۹۸۰ء میں شائع ہونے والے ایک افسانے میں یوں دیکھا جا سکتا ہے:

''مجھے عجیب سی بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ بے چارگی اور مایوسی کے اندھیرے چاروں طرف رقص کر رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے میرے اندر والے فنکار کو قتل کر دیا ہے اور میں اپنی لامتناہی تلاش کے سفر میں ایک ایسے ٹیلے پر کھڑا ہوں جس کے ایک طرف سربفلک دشوار گزار پہاڑ ہیں اور دوسری طرف گہرا ناقابل عبور سمندر۔ ایک طرف سینکڑوں اژدہوں اور عفریتوں کی پھنکاریں ہیں تو دوسری طرف آبی بلاؤں کی چیخیں۔ میں اپنے آپ کو پکارنا چاہتا ہوں مگر میری صدا بھی کہیں کھو گئی ہے۔۔۔۔۔تب میری تجرید کی ساری معنویت مجھ پر آشکار ہوتی ہے۔۔۔۔یہ معنویت اتنی گھناؤنی اور مکروہ ہے کہ میں کسی کو بھی اس سے آگاہ کر کے خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ یہ معنویت صرف میری نہیں۔۔۔ہم سب کی ہے۔شاید اسی لئے وہ مقدس آواز بھی اب نہیں آ رہی ہے جس نے کہا تھا:''خارجی دنیا کو بھی تمہارے اس کشف کا ادراک ہونا چاہیے!''(افسانہ''اپنی تجرید کے کشف کا عذاب'')

امریکہ اور اس کے حلیفوں کے ذریعے اس وقت جو نام نہاد صلیبی جنگ شروع کی گئی ہے،اس کے دیگر مقاصد سے قطع نظر اگر اسے صرف صلیبی رنگ میں ہی لیا جائے تب بھی یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کی باہمی لڑائی ہے۔بنی اسرائیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد کی ایک شاخ ہیں جن سے یہودی اور مسیحی مذاہب نکلے۔۔۔جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے حضرت محمد ﷺ ہوئے جو دینِ اسلام کے بانی ہیں۔اس وقت امریکہ اور اسرائیل کے گٹھ جوڑ کو مذہب کے ساتھ خاندانی سطح پر دیکھا جائے تو ایسے لگتا ہے کہ اسحاق علیہ السلام کی اولاد اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے ساتھ وہی سوتیلا سلوک کر رہی ہے جو ماضی بعید میں ایک بار پہلے بھی ہو چکا ہے۔۔۔عام مسلمانوں کو عمومی طور پر علم نہیں ہے کہ مسیحی اور یہودی دنیا کی نظروں میں ہمارا شجرہ

نسب کیا ہے۔ بائبل کی رُو سے بی بی ہاجرہ کی حیثیت بی بی سارہ کی لونڈی کی تھی۔اور وہ اسماعیل علیہ السلام کو لونڈی کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔ابراہیم علیہ السلام کی حقیقی اولاد میں شمار نہیں کرتے۔اسی سے ان کی ذہنیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ میں نے ۱۹۸۲ء میں افسانہ لکھا تھا ''میں انتظار کرتا ہوں''۔سوتیلے جذبوں کی اذیت سہتے ہوئے اس افسانے میں تین اہم تاریخی کرداروں کو ایک کردار میں یکجا کیا گیا تھا۔اس میں سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حوالے سے جو کچھ آیا تھا اس کی ہلکی سی جھلک یہاں دیکھ لیں۔۔باقی پورا افسانہ تو اپنے پورے تناظر میں ہی پڑھنے سے سمجھ میں آئے گا:

''میری بے گناہی۔۔۔میری نیکیاں دنیا نہیں دیکھتی اور میں تہمتوں کی زد میں ہوں۔
میں اذیت میں ہوں کہ میری ماں ابھی تک میری خاطر پانی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔وہ جو بادشاہ زادی ہے۔ میرے سوتیلے بھائی اسے لونڈی اور مجھے لونڈی کا بیٹا کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
میرے سوتیلے عزیز تاریخ کو جتنا چاہیں مسخ کر لیں مگر وہ میرے باپ کا نام کیونکر مٹا سکیں گے کہ پھر وہ خود بھی بے شناخت ہو جائیں گے۔
میں ابراہیم کا بیٹا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
آگ ابراہیم کے لئے گلزار ہو گئی تھی تو مجھے کیونکر نقصان پہنچا سکے گی۔
''آگ سے ہمیں مت ڈراؤ یہ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی بھی غلام ہے۔''
یہ آسمانی آواز مجھے یقین دلاتی ہے کہ میری ایڑیوں کی رگڑ سے ایک چشمہ پھوٹ بہے گا اور اس کا پانی میری مدد کو آئے گا۔''

اس نوعیت کے اتنے حوالے میرے سامنے آئے کہ انہیں پڑھتے ہوئے مجھے اپنی تخلیقات میں خود ایک انوکھے وجدان کا احساس ہوا۔شاید میں خود کبھی ایسے اشارات کو کسی مضمون کی صورت میں یکجا کر دوں جواب تک کے حالات میں ظاہر ہو چکے ہیں۔شاید اسی کیفیت کو بھانپ کر جیلانی کامران صاحب نے میرے افسانوں کے حوالے سے لکھتے ہوئے اپنے تجزیہ کا

اختتام ان الفاظ پر کیا تھا کہ

''ان افسانوں میں ایک ایسا رویہ بھی شامل ہے جو کہانی سنتے ہوئے سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کہانی محض کسی واقعے ہی کی بات نہیں کرتی بلکہ اس سچائی کا ذکر بھی کرتی ہے جو واقعیت کے رگ وریشے میں جاگتی ہے اور سب سے کہتی ہے کہ مجھے پہچانو، میں کون ہوں؟ سچائی نے ہمارے زمانے میں افسانے کا لباس پہن رکھا ہے''

یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ دنیا ایک نئے دور میں داخل ہو چکی ہے ہم لوگ روایات کے نام پر ابھی تک ماضی سے چمٹے ہوئے ہیں، ماضی سے جُڑ کر رہنا کوئی بری بات نہیں اگر آپ اس کے ساتھ حال سے باخبر رہتے ہوئے مستقبل کی طرف بھی قدم بڑھاتے رہیں۔ایک بہت ہی ہلکی پھلکی سی ذاتی واردات یاد آ گئی۔ میں ایک بار انٹرنیٹ پر بیٹھا ہوا ایک ویب سائٹ سے اپنی پسند کا گانا ''چٹھی میری ڈھول نوں پچائیں وے کبوترا'' سن کر کچھ جذباتی بھی ہو رہا تھا اور ساتھ ساتھ آئی ہوئی ای میلز کے جواب بھی دیتا جا رہا تھا۔اپنے اس عمل سے میں نے بعد میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ماضی سے کٹ کر نہیں رہنا لیکن ماضی کے چکر میں حال اور مستقبل سے غافل ہو جانا بھی ٹھیک نہیں ہے۔اخلاقی قدریں بھی دو طرح کی ہیں ایک تو وہ جن کی حیثیت مستقل نوعیت کی ہے، دوسری وہ جو زمانے کے ساتھ بدلتی جاتی ہیں۔مثلاً ایک طویل دور تک سینہ تان کر لڑنا اور سینے پر زخم کھانا بہادری کی علامت تھا۔اب ہولناک بموں کے دور میں ایسا کرنا بہادری نہیں بلکہ سیدھی سی بے وقوفی ہے۔ایک قدر جو ہمارے بچپن تک بہت اہم رہی یہ تھی ''پڑھو گے لکھو گے بنو گے نواب۔ جو کھیلو گے، کودو گے، ہو گے خراب''۔آج کے دور میں سپورٹس کے سٹارز کی جو حیثیت ہے اور ان کے مقابلہ میں بڑی بڑی ڈگریاں رکھنے والوں کی جو بے توقیری ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بہت سی قدریں کس حد تک بدل کر رہ گئی ہیں۔ بہر حال وقت کی رفتار تو اپنے بہاؤ میں رہتی ہے۔''

(یادوں کے باب ''میری عمر کا ایک سال'' سے اقتباس۔مطبوعہ دوماہی ''گلبن''، لکھنو۔ مئی، جون ۲۰۰۴ء)۔۔۔۔یہی باب سال ۲۰۰۴ء کے شروع میں ہی روزنامہ ''جنگ'' لندن کے

ادبی صفحہ پر دو قسطوں میں شائع ہوا تھا۔

اقتباس

نذر خلیق: ''میری محبتیں'' آپ کے خاکوں کا مجموعہ ہے اس کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے افسانہ نگار حیدر قریشی کوئی اور ہے اور خاکہ نگار حیدر قریشی کوئی اور ہے یہاں آپ کا اسلوب افسانوی اسلوب سے بالکل مختلف ہے ایسا کیوں ہے؟

حیدر قریشی: اس سوال کا جواب دو جمع دو چار کی طرح تو نہیں دے سکتا۔اس کے جواب کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں ایسے پہلو بھی جو ایک دوسرے سے متصادم ہوں۔آپ کے سوال کے بعد غور کرتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ میری بالکل ابتدائی کہانی مامتا اور اب تک کی آخری کہانی مسکراہٹ کا عکس، یہ دونوں کہانیاں براہِ راست ہمارے گھر کی کہانیاں ہیں۔

مامتا میں، میں نے اپنی بیوی کے دکھ کو محسوس کیا تھا اور اس کی کہانی کو خود میں محسوس کر کے لکھا تھا۔ادبی زندگی میں یہ پہلی کہانی تھی جسے لکھنے کے بعد میں سچ مچ رویا تھا۔دوسری کہانی خود میرا اپنا نفسی تجربہ تھا جو یہاں جرمنی میں مجھے پیش آیا۔اسے آپ سوتی جاگتی حالت کا تجربہ کہہ سکتے ہیں۔اس تجربہ کے دوران مجھے جو کچھ پیش آیا وہی کچھ مجھے اس کہانی کو لکھنے کے بعد پیش آیا۔یعنی میں جی بھر کر رویا۔تو میرے بھائی میری کہانیوں میں تو میری زندگی کے کئی کردار آئے ہیں۔خاکہ نگاری اور افسانے کی اپنی اپنی حدود ہیں۔لیکن ''مسکراہٹ کا عکس'' میں تو جیسے یہ حدود ایک دوسرے سے مل گئی ہیں۔

(حیدر قریشی سے لیئے گئے ڈاکٹر نذر خلیق کے انٹرویو 'انٹرنیٹ کے ذریعے مکالمہ' سے اقتباس۔ مطبوعہ کتاب ''حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز' مرتب سعید شباب۔خان پور مطبوعہ ۲۰۰۴ء
سہ ماہی ''توازن مالے گاؤں، شمارہ ۴۰۔۔۔عمرِ لاحاصل کا حاصل عوامی ایڈیشن، دہلی، ۲۰۰۵ء)

ایک اور وضاحت

''حوا کی تلاش''(اوراق فروری ۱۹۸۱)،''گلاب شہزادے کی کہانی''(اوراق اپریل

۱۹۸۲ء)،''کاکروچ''(صریر فروری ۱۹۹۲)۔۔۔یہ تینوں کہانیاں ایٹمی جنگ کے بعد کی فضا کے موضوع پر ہیں۔۱۹۸۱ء تک اردو میں اس موضوع کو کسی اور افسانہ نگار نے بالکل مس نہیں کیا تھا۔پہلی کہانی مذہبی حوالوں سے، دوسری کہانی تیل کی دولت کے اشارے کے ساتھ سیاسی حوالے سے اور تیسری کہانی سائنسی حوالے سے ایک ہی موضوع کو الگ الگ انداز سے دیکھتی ہیں۔ان کے علاوہ افسانہ ''گھٹن کا احساس'' میں بھی اور افسانہ ''کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار'' میں بھی ضمناً ایٹمی جنگ کے موضوع کو مس کیا گیا ہے۔یوں خدا اور کائنات کے بارے میں غور اور جستجو کے ساتھ اس دھرتی کی بقا کا مسئلہ بھی بنیادی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔

نئی کہانیاں اور پرانی باتیں

محترمہ کلثوم رقیّہ صاحبہ نے میرے افسانوں کے دو مجموعوں کے افسانوں کے بعد کے پانچ افسانوں کے بارے میں چند سوالات پوچھے ہیں۔میرا خیال ہے کہ ان میں سے ''کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار'' پر تو ڈاکٹر کامران کاظمی کے مختصر مقالہ میں مناسب بات ہو چکی ہے اور ''نیک بندوں کی بستی'' تو ویسے ہی سادہ سی کہانی ہے۔باقی تین کہانیوں کے حوالے سے چند باتیں عرض کر دیتا ہوں۔

''اپنے وقت سے تھوڑا پہلے'' زندگی کے پراسرار تجربوں اور قریبی رشتوں سے بندھی ہوئی کہانی ہے۔صوفیانہ لہریں اور وجدانی کیفیات میرے افسانوں میں پہلے سے موجود ہیں۔اسی طرح قریبی رشتوں سے بھی میں ہمیشہ سے جڑا ہوا ہوں۔اب اس میں تجربے کی نوعیت پہلے تجربوں سے زیادہ گھنی ہو گئی ہے اور رشتوں سے وابستگی بھی اپنی جڑیں مزید مظبوط کر چکی ہے۔اس لحاظ سے یہ پہلی کہانیوں کے تسلسل میں آگے کا سفر ہے۔

جنسی نفسیات کے حوالے سے میں پہلے بھی چند افسانے لکھ چکا ہوں۔''کار اور شیرنی'' بھی اسی کا تسلسل ہے لیکن پہلے والے افسانوں میں اور ''کار اور شیرنی'' میں بھی آپ کو نمایاں فرق دکھائی دے گا۔اس موضوع پر مزید غور کرتے ہوئے اور انسانی زندگی کی اس اہم سرگرمی سے

گزرتے ہوئے بڑھتی عمر کے ساتھ نیا کچھ بھی منکشف ہوا ہے جو آپ کو ''کاراور شیرنی'' میں دکھائی دے گا۔

''کہانی کی کہانی'' کو قدرے پیچیدہ سمجھا گیا ہے پھر اس میں دو تین ضمنی سوال بھی اٹھائے گئے ہیں۔کسی فلم ایکٹریس کو اتنی زیادہ اہمیت کیوں؟۔۔پھر اس کا نام اتنا واضح کیوں بیان کیا گیا؟ مجھے دوسری خوبصورت ایکٹریسوں کے نام بھی بتائے گئے کہ یہ بہت زیادہ خوبصورت ہیں۔۔۔یہ سوال بھی ہوا کہ افسانہ، کہیں خاکہ نما، کہیں مضمون اور کہیں کچھ اور لگنے لگتا ہے۔یہ سارے سوال درست ہیں۔

''کہانی کی کہانی'' اس پیچیدہ کائنات کی کہانی کی ہلکی سی جھلک ہے۔اتنی پیچیدہ کائنات ہے تو کچھ نہ کچھ پیچیدگی تو محسوس ہونا ہی تھی۔تاہم یہ ایسی پیچیدہ بھی نہیں کہ بالکل سمجھ سے باہر ہو جائے۔مثلاً اس میں دائرے کو اہمیت اور فضیلت دی گئی ہے۔اسے توحید کی علامت سمجھ لیں۔اس سے کسی دوسرے عقیدے کی تکذیب بھی نہیں کی گئی بلکہ جتنے بھی تصورات ہیں انہیں کسی جیومیٹری یا اورحساب سے کوئی صورت دے دیں تو وہ ساری مثلث، مربع، مستطیل شکلیں اپنی جگہ موجود ہیں لیکن دائرے نے ان سب کا احاطہ کیا ہوا ہے۔پھر دوسری ہر صورت کا آغاز بھی ہے اور اختتام بھی لیکن دائرے کے کسی آغاز یا اختتام کا تعین کرنا ہی ممکن نہیں۔مفروضے کے طور پر جس جگہ کو آپ دائرے کا اختتام قرار دیں، وہیں سے اس کا آغاز ہو رہا ہے اور یہی میری کہانی کا اختتام اور آغاز ہے۔

فلم ایکٹریس کا نام دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ہمارے عقائد کی دنیا میں پیاسے کتے کو پانی پلانے والی طوائف کی بھی بخشش ہو جاتی ہے اور طوائف کو بھی سچے خواب آسکتے ہیں۔یہ کہانی نیکی اور ثواب کے روایتی تصور سے ہٹ کر انسانیت کی کسی ارفع سطح سے متعلق ہے۔فلمی دنیا بھلے گلیمر کی دنیا ہے لیکن اب تو ایک دنیا اس کی اسیر ہے۔بے شک بے شمار دوسری خوبصورت ہیروئنیں ہیں۔جہاں تک خوبصورتی کا تعلق ہے،شوبز سے وابستہ ساری خواتین ہی خوبصورت ہوتی ہیں۔میں ماہی گل کی جگہ کسی اور کا نام لکھتا تو تب بھی یہی سوال ہو سکتا تھا کہ یہی کیوں؟

باقی ماہی گل اب کوئی سپر سٹار نہیں ہیں، اچھی اداکارہ ہیں لیکن فلمی دنیا سے تقریباً کنارا ہی کر چکی ہیں لیکن ان کا مجموعی تاثر ایسا ہے کہ میری کہانی میں وہی آسکتی تھیں۔میں ایک زمانے میں سادھنا کی فلمیں وضو کر کے دیکھا کرتا تھا لیکن وہ بھی ''کہانی کی کہانی'' میں نہیں آسکیں۔پاکستان میں نیر سلطانہ اور زیبا سے لے کر رانی تک جادوئی حسن والی متعدد ہیروئنیں تھیں۔انڈو پاک کے مزید نام لینے لگوں تو ایک لمبی فہرست بن جائے گی۔ہاں ایک نام ہے فردوس کا۔۔۔اگر ماہی گل کی جگہ کوئی اور نام دیتا تو وہ فردوس کا ہو سکتا تھا لیکن یہ سب کچھ میں نے غور و خوض کر کے طے نہیں کیا تھا۔بات ہی کچھ ایسی تھی کہ ماہی گل خود کہانی میں آگئیں۔اور آگئیں تو بس آگئیں۔

''کہانی کی کہانی'' میں بعض دوسری اصناف جیسے تاثر کی بات ایک حد تک درست ہے۔سہ ماہی ''شعر و سخن'' کے مدیر جان عالم کو جب میں نے یہ افسانہ بھیجا تو انہوں نے بھی بعض دوسری اصناف کے مدغم ہونے کی طرف توجہ دلائی۔تب میں نے انہیں بتایا کہ ایسا بیس سال پہلے سے ہو رہا ہے اور میں نے خود اس صورت حال کا ذکر کر رکھا ہے تو وہ مطمئن بلکہ خوش ہو گئے کہ آپ کو اس کا ادراک ہے اور آپ شعوری طور پر ایسا کر رہے ہیں تو پھر ٹھیک ہے۔

بہت پہلے سے اس کا ادراک ہونے کا ایک ثبوت تو اسی مضمون میں ڈاکٹر نذر خلیق کے انٹرویو میں موجود ہے جس میں میں نے کہا ہے کہ

''خاکہ نگاری اور افسانے کی اپنی اپنی حدود ہیں۔لیکن ''مسکراہٹ کا عکس'' میں تو جیسے یہ حدود ایک دوسرے سے مل گئی ہیں۔''

یہ ۲۰۰۳ء یا ۲۰۰۴ء کا انٹرویو ہے۔''مسکراہٹ کا عکس'' میرے ابا جی کے حوالے سے اہمیت کا حامل افسانہ تھا اور مزے کی بات یہ ہے کہ ''اپنے وقت سے تھوڑا پہلے'' میں بھی ابا جی کا مرکزی کردار موجود ہے۔

''کھٹی میٹھی یادیں'' کا باب ''روح اور جسم'' پہلی بار ''جدید ادب'' جرمنی کے شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا تھا۔اس میں میرے یہ الفاظ دیکھ لیں۔

''ان دنوں میں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میری مختلف اصنافِ ادب میں تخلیق کاری کا عمل

دوسری اصناف میں کچھ کچھ مدغم ہونے لگا ہے۔مثلاً یادوں کی گزشتہ اور موجودہ قسط میں یادوں کے ساتھ افکار وخیالات کی زیادہ یلغار ہو رہی ہے،یوں یادیں مضمون جیسی صورت اختیار کر رہی ہیں۔اسی طرح میرے آخری تین افسانوں (مسکراہٹ کا عکس،کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار اور اپنے وقت سے تھوڑا پہلے) میں یادوں کے گہرے اثرات کہانی کا رُوپ اختیار کر گئے ہیں۔اگر چہ ایسے اثرات میری دوسری کہانیوں اور دیگر تخلیقات میں بھی ہیں لیکن اتنے گہرے نہیں جتنے مذکورہ تین افسانوں میں در آئے ہیں۔‘‘

میرا خیال ہے ابھی اتنا لکھا ہوا کافی ہے۔گفتگو کی گنجائش ہوئی تو اس کے بعد بھی حاضر ہوں۔

اہلِ قلم کے تاثرات

ڈاکٹر وزیر آغا(لاہور)

پتھر ہوتے وجود کا دکھ "بہت عمدہ افسانہ ہے۔اگر آپ اسی رفتار اور انداز سے آگے بڑھتے رہے تو بہت جلد صف اول کے افسانہ نگاروں میں شمار ہونے لگیں گے"۔

....

جوگندر پال(دہلی)

افسانہ نگار کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کے کردار زندگی کر کر کے اپنی کہانیاں بناتے ہوئے محسوس ہوں اور ان کہانیوں کے تناظر میں اگر پانی میں آگ لگنا یا انسانی وجود کا پتھرا جانا ہی تخلیقی طور پر صحیح ہو تو ایسے سانحات کو انہونا قرار دے کر ان سے ہاتھ نہ کھینچ لیا جائے۔ایسا کرنا افسانوی واقعیت کو مجروح کرنے کے مترادف ہوگا۔حیدرقریشی کے یہاں ایمان کا کراماتی عمل کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ایمان زندہ رہے تو معجزوں کا رونما ہوتے چلے جانا بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا۔حیدرقریشی کے ایمان کی توانائی اسے انہدام کی ہیبت سے محفوظ رکھتی ہے۔نہ صرف یہ بلکہ اسے انہدام کے انہدام کا پورا یقین ہے اور اس قیامت کا نظارہ کرنے کے لئے وہ اپنی آنکھیں وا کئے ہوئے ہے۔ہر چہ بادا باد!۔۔۔۔۔۔حیدرقریشی اسی وسیع تر زندگی کی دریافت کے لئے اپنی کہانیاں تخلیقتا ہے۔اپنے اس کھلے کھلے راستے کو طے کر کے اسے دور یا نزدیک کسی شیشے کے محل میں اقامت نہیں اختیار کرنا ہے، بلکہ راستوں سے راستوں تک پہنچنا ہے اور ہر راستے پر تباہ حال زندگی کی بازآباد کاری کئے جانا ہے۔وہ لکھ لکھ کر گویا کچھ بیان نہیں کر رہا ہوتا، بلکہ اپنے لکھے ہوئے کو کر رہا ہوتا ہے اور اسے ایسا کرتے ہوئے پا کر بے لوث انسانی رشتوں پر باور کر لینا غیر مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

....

پروفیسر جیلانی کامران (لاہور)

حیدرقریشی کے افسانوں کی دنیا عصر حاضر کے حالات، واقعات اور امکانات سے رونما ہوتی ہے۔اور رونما ہوتے ہی انسانوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔اس مقام تک حیدرقریشی اجتماعی کیفیت کو ہمراہ لے کر چلتے ہیں۔لیکن بہت جلد یہ اجتماعی کیفیت اپنے بطن سے انفرادی کیفیت اخذ کرتی ہے۔اس تخلیقی عمل کے ساتھ ضمیر متکلم آشکار ہوتی ہے اور یہ صورت حیدرقریشی کے افسانوں کو اوران افسانوں کے مرکزی انسان کو انفرادیت فراہم کرتی ہے۔

نئے افسانے کے آداب اور مزاج کی روشنی میں یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ نیا افسانہ اپنے منظر کی بجائے اپنے انسان کے گرد گردش کرتا ہے اور اس کا انسان ہی اس کا محور ہے۔لیکن نئے افسانے کے لکھنے والے عموماً حالات اور فرد کا رشتہ تخلیق کرتے ہوئے فرد کے مقابلے میں حالات کو بے حد طاقت ور بتاتے ہیں اور اس تناسب سے فرد کی انا کو برابر کمزور ہوتے دکھاتے ہیں۔ایسا فرد افسانے کی دنیا میں حالات کے جبر سے شکست کھاتا ہے اور حالات کے پیدا کئے ہوئے ماحول میں اپنے ٹوٹے ہوئے وجود ہی کی نشاندہی کرتا ہے۔حیدرقریشی کے افسانوں میں ایسے حالات بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔اس لیے ان افسانوں کا انسان وجود کی شکست وریخت سے دوچار نہیں ہوتا۔اس کی انا برابر قائم رہتی ہے اور وہ ہر لمحے حالات کو غلبہ پانے سے روکنے کی سعی کرتا ہے۔ایسا انداز نظر اس لحاظ سے بھی قابل توجہ ہے کہ افسانہ جس دنیا کی نشاندہی کرتا ہے اس میں فرد کا طرز عمل تہذیبی رویوں کی ترجمانی کرتا ہے۔فرد کے ٹوٹنے سے تہذیبی شعور میں دراڑیں رونما ہوتی ہیں۔ حیدرقریشی کا افسانہ اس تہذیبی دوراہے کا ازالہ کرتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حیدرقریشی نے ان افسانوں کے ذریعے کہانی کے کینوس کو وسیع کرتے ہوئے نئے امکانات کی طرف اشارا کیا ہے اور اس سچائی کو نمایاں کیا ہے کہ Limit Situation کے دوران انسان صرف کرب ہی کی نمائندگی نہیں کرتا اور نہ اس کا وجود ہی پاش پاش ہوتا ہے بلکہ اس کے نطق سے اس کی اپنی تاریخ گفتگو کرتی ہے۔ ہمارا افسانہ تاریخ کے اس مکالمے سے شاید اب تک غافل تھا۔حیدرقریشی نے اپنے افسانوں کی راہ سے تاریخ کے اس مکالمے کو سننے کی سعی کی ہے۔

دیویندر اسر (دہلی)

حیدرقریشی تاریخ کے جھروکے میں جھانکتے ہیں، تہذیبوں کی سرحدوں کو عبور کرتے ہیں، مذہبی صحیفوں کی نظریاتی اور روحانی گتھیاں سلجھاتے ہیں۔انسان کی روح میں اترتے ہیں، اسکے دل کو بلوتے ہیں، اس کے تصور کے ساتھ اڑان بھرتے ہیں اور جسم کی لذت سے بھی آشنا ہوتے ہیں اور یوں کہانیاں روپ بدل بدل کر شیشا گھر میں اترتی چلی جاتی ہیں۔حیدرقریشی کی کہانیوں کی دنیا ایسے کرداروں سے آباد ہے سچائی کا المیہ جن کی قسمت بن چکا ہے۔ اسی لئے انہوں نے اپنی کہانیوں کے اردو مجموعے کا نام "روشنی کی بشارت" رکھا ہے۔ظاہر ہے ایسی کہانیوں میں اس نوع کا سچ نہیں ہے جسے اکثر ہم مجسم کائناتی سچ، سماجی سچ یا نام نہاد بھوگا ہوا سچ کہتے ہیں، کیونکہ ایسی کہانیوں میں دل کا بے انت پاتال ہے، روح کا سارا آکاش ہے، جسم کی حدوں کو توڑتا ہوا تفکر اور قوت متخیلہ ہے-- انسان اپنی کل ثقافت، جامع تاریخ، اپنے تمام گناہ وثواب کی پونجی لئے اپنے آپ سے مخاطب ہے۔میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کدھر جا رہا ہوں؟---یہ ایسے سوالات ہیں جو مجھے بھی مسلسل ستاتے رہتے ہیں، یہ سب کیا ہے؟ میں کیوں ہوں؟ یہ جیون کیا ہے؟ میں کیوں زندہ ہوں؟ موت کیا ہے؟ روح، غیر روح، وجود، عدم وجود، انسان، خدا، خلا!! حیدرقریشی کی کہانیاں ایسے ہی سوالوں سے پریشان ہیں اسی لئے ان کی کہانیوں میں مجسم وارداتوں کی بجائے تفکر اور احساس کی لطافت ہے۔ایسی کہانیوں میں "ایک کافر کہانی" "روشنی کی بشارت" اور "روشن نقطہ" بطور خاص قابل ذکر ہیں۔اب آپ چاہیں تو انہیں پراسرار صوفیانہ مزاج کی کہانیاں بھی کہہ سکتے ہیں۔۔۔۔۔دراصل حیدرقریشی کی کہانیاں کائناتی انسان، خدا، روح، ثقافت اور ثقافتی وراثت کے ازلی سوالوں کی کہانیاں ہیں۔ایسی کہانیاں اردو میں بہت کم لکھی گئی ہیں۔کسی ایک مصنف کے ہاں ایسی ایک دو کہانیاں نظر آجائیں گی لیکن کوئی ایک ہی مصنف ان ازلی سوالوں، نظریات اور حسیات سے جھوجھتا رہے ایسا کوئی دوسرا کہانی کار میری نظر میں نہیں ہے۔۔۔۔حیدرقریشی کی کہانیاں ایک نئی تخلیقی روایت کی شروعات ہیں جو واقعاتی تسلسل اور کہانی پن پر مبنی ہو کر سوال، شک اور فکر کی بنیاد پر کہانی کا شفاف شیشا گھر تعمیر کرتی ہیں۔اس شیشا گھر

میں ہم داخل ہونے کے لئے آزاد ہیں لیکن اس سے باہر نکلنے کے رستے بند ہیں، صرف ایک چھوٹا سا روشن دان کھلا ہے، ہمارے دل کا--- جس میں نہ جانے کہاں سے روشنی کی کرن چھٹک کر آ رہی ہے جس کے ساتھ ساتھ چل کر ہم وقت کے اس نقطہ پر پہنچتے ہیں جہاں سچ ہمارا منتظر ہے۔

جہاں سچ سے ہم معانقہ کرتے ہیں!

■■■■■■■■■■■■■

ڈاکٹر قمر رئیس (دہلی)

" کہانیاں علامتی ہیں لیکن معاصر جدید کہانیوں سے الگ اور انوکھی۔ یہاں تاریخ گنگناتی ہے۔ انسانی تہذیب سرگوشیاں کرتی ہے اور ان کی کوکھ سے آج کے جلتے ہوئے مسائل پھنکار مارتے نکلتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ پرکشش کہانیاں جو سوچنے پر اکساتی ہیں"۔

■■■■■■■■■■■■■

ڈاکٹر انور سدید (لاہور)

"حیدر قریشی بظاہر ادب کی کئی اضاف میں ایک طویل عرصے سے بڑی پختہ کاری سے تخلیقی کام کر رہے ہیں تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ افسانے کے دیار میں قدم رکھتے ہیں تو فطرت اپنے اسرار کی گتھیاں ان پر بانداز دگر کھولتی ہے۔ "روشنی کی بشارت" ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے لیکن وہ نئے افسانہ نگار نہیں۔ ان کا شمار ساتویں دہے کے ان افسانہ نگاروں میں کرتا مناسب ہوگا جو تجریدیت سے معنی کا نیا مدار طلوع کرتے اور سوچ کو نئی کروٹ دیتے ہیں۔ "روشنی کی بشارت" کے افسانوں میں حیدر قریشی کرنوں کے تعاقب میں سرگرداں نظر آتا ہے لیکن جب اسے سدھارتھ کا معصوم چہرہ نظر آجاتا ہے تو اسے اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس کل جگ میں زندہ رہنے کا جواز موجود ہے۔

■■■■■■■■■■■■■

ڈاکٹر حمید سہروردی (گلبرگہ)

حیدر قریشی کے افسانے پریم چند اور یلدرم کے اسلوب و مزاج کی آمیزش اور آویزش سے اپنا ایک نیا افسانوں مزاج اور ڈکشن تیار کرتے ہیں۔ ان کا تجربہ ہم سب کا تجربہ بن جاتا ہے۔ ان کی

بصیرت تیز اور روشن ہے اور وہ افسانے کی میڈیم سے روزمرہ زندگی کے انگنت تجربوں کو کچھ اس طرح سے گرفت کرتے ہیں کہ زبان و قلب سے بے ساختہ حیرت اور استعجاب کے کلمات ادا ہوتے ہیں۔ حیدر قریشی اپنے رنگ و مزاج کو اپنے ہر افسانے میں افسانوی زبان کے تخلیقی و اکتسابی امتزاج کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کی خوبی نہ صرف ڈکشن میں ہے بلکہ موضوعات کے برتاؤ میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

میں ذاتی طور پر حیدر قریشی کو جدید تر افسانوی میدان میں کامیاب و کامران سمجھتا ہوں۔ ان کا یہی انداز توازن و تناسب کے ساتھ برتا جائے تو وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھیں گے اور وہ حضرات جو جدید اور جدید تر افسانے کے باب میں شاکی ہیں اطمینان حاصل کر لیں گے"۔

■■■■■■■■■■■■■

ڈاکٹر فہیم اعظمی (کراچی)

"حیدر قریشی الہامی قصص، اساطیر، ذاتی اور معاشرتی مسائل کو آپس میں مدغم کر کے ایک ایسا آئینہ تخلیق کرتے ہیں جس میں پیدائش سے موت تک زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ بیشتر کہانیوں میں میجر کردار خود کہانی کار کی ذات ہوتی ہے اور اس طرح حیدر قریشی فلسفیانہ، مذہبی اور اخلاقی قدروں پر رائے بھی دیتے ہیں تو کسی غیر متعلق یا خارجی خیال آرائی کا احساس نہیں ہوتا اور سب کچھ کہانی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔

حیدر قریشی کی کہانیاں زمینی زندگی کے معمولی واقعات سے شروع ہوتی ہیں جنہیں فلو بیر کے لفظوں میں SLICES OF LIFE کہا جاسکتا ہے مگر ان میں جلد ہی مذہبی، عقیدتی اور رحانی رنگ بکھرنے لگتا ہے اور ان کی اٹھان عمودی ہو جاتی ہے۔ پھر ان کہانیوں کی فضا زمین اور آسمان کے بہت بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اکثر کہانیوں کا اسلوب داستانی معلوم ہوتا ہے لیکن لہجہ کا دھیما پن، علامتوں، تمثیلوں اور تلازمے کا استعمال انہیں داستانی رنگ سے الگ بھی کرتا ہے۔ کہیں کہیں مذہبی عقائد کا اظہار بھی ہوتا ہے مگر جمالیاتی طور پر ان میں نہ کوئی خطابیت پیدا ہوتی ہے اور نہ کسی آئیڈیل یا انفرنل دنیا میں داخل ہونے کی ترغیب ہوتی ہے۔ حیدر قریشی کی کہانیوں

میں زبان اور حوالہ جات اس وقت، زمانے اور علاقے کی حدوں کا تاثر ضرور دیتے ہیں جب اور جہاں ان کی کہانیوں نے جنم لیا کیونکہ اس سے کسی تخلیق کار کو مفر نہیں، لیکن ان کہانیوں کا مجموعی سپکٹرم زمان اور مکاں کی قید سے آزاد ہوتا ہے اور دنیا کے کسی بھی حصے کا قاری ان کہانیوں میں امکانی سچائی دیکھ سکتا ہے"۔

■■■■■■■■■■■■■■

اکرم محمود (امریکہ)

آپ کے پانچ افسانے پڑھے ہیں۔کیا بات ہے۔بتا نہیں سکتا کہ کیسا لطف آیا۔بلا مبالغہ بار بار ایسا محسوس ہوا کہ کسی کیفیت نے میرے پورے جسم کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے۔افسانہ ختم ہونے پر بھی یہ گرفت ختم نہیں ہوئی۔

■■■■■■■■■■■■■■

اشعر نجمی (تھانے)

''ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس سے آپ کی کتاب ملی۔اس کتاب نے زخم پر مرہم کا کام کیا۔اب تک میں آپ کی شاعری کا قتیل رہا ہوں لیکن اس کلیات میں شامل آپ کی نثر نے مجھے مبہوت کر دیا ہے۔خاص کر آپ کے افسانے تو بہت خوب ہیں۔ پتہ نہیں کیوں ہمارے نقادوں کو اس پر گفتگو کرنے کی توفیق نہیں ہوئی؟'' **(اشعر نجمی کی ای میل بنام حیدر قریشی ۹ مارچ ۲۰۰۹)**

■■■■■■■■■■■■■■

جان عالم (مانسہرہ)

روشنی کی بشارت پر رائے

واہ بھائی واہ۔۔مزہ آ گیا۔کہاں سے بول رہے ہیں آپ۔۔۔بڑی مبارک کیفیت میں یہ افسانہ تخلیق ہوا ہے۔مزہ آ گیا۔**جان عالم**

میں انتظار کرتا ہوں پر رائے

واہ بھائی۔۔۔کیا خوب افسانہ ہے۔مجھے اس کی ان پیج کاپی بھیجیں۔۔۔اس پر بات کرنا آسان نہیں۔۔۔اس کے لیے عالمِ ارواح میں یومِ الست تک جانا ہوگا اور پھر انسانیت کے المیوں سے گزرنا پڑے گا۔۔۔خیر و شر کی ازلی داستان کا حصہ بننا پڑے گا۔۔۔فکر کو سوالوں کے صحرا میں ایڑیاں رگڑنی

پڑیں گی۔آگ کا الاؤ۔۔۔بَن باس۔۔۔۔اور پھر اس تلخابے سے پھوٹنے والے چشمے تک کا سفر کرنا پڑے گا۔اور آخر کار جب سب ہاتھ میں آئے گا۔۔۔تو سب کو چھوڑ دینے کا اعلان کر کے سب کو محبت میں گرفتار کر لیا جائے گا۔یہ اتنا آسان نہیں۔اس پہ کہنا اتنا آسان نہیں۔اسی لیے اس پر کوئی بولا نہیں۔میں ابھی اسے پڑھ کر اس میں اتر گیا۔۔۔تھک گیا۔۔۔۔آپ نے تین چار صفحات میں زندگی بھر کا چکر لگوا دیا۔۔۔۔واہ۔۔۔جزاک اللہ۔۔۔۔**جان**

■■■■■■■■■■■■■■

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

'عمرلاحاصل کا حاصل' میں درج شدہ سارے افسانے پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انہوں نے اردو افسانے کی مروجہ حدوں کو پار کرنے کی ہمت جتائی ہے۔اس سے قبل ہمت، جسارت اور بغاوت کے القاب ان افسانہ نگاروں کے لیے استعمال کیے جاتے رہے ہیں جو روایتی موضوعِ ممنوعہ یعنی جنس کو اپناتے تھے۔جنس کے بعد سیاسی اور مزاحمتی موضوعات کا معاملہ آتا ہے۔ حیدر قریشی ان موضوعات کے دلدادہ نکلے جو مجذوبوں کو ساجتے ہیں۔ وہ ایسے سوالات کے جوابات کے متلاشی معلوم ہوتے ہیں جو قریب قریب لاجواب ٹھہرائے جاتے رہے ہیں۔ یہ بڑا کام ہے اور شاید اسی سبب سے ان کے مختصر لیکن 'بڑے افسانے' قاری کا تعاقب کرتے رہتے ہیں۔آخری سطر پڑھنے پر بھی جان نہیں چھوڑتے سوچنے پر مائل اور دہرانے پر مجبور کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ حیدر قریشی کا افسانہ پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے ذاتی زندگی کے کسی تجربے سے گزرنا۔ ایسے تجربے سے جو سوچ، کشف اور بشارت سے عبارت ہے۔

■■■■■■■■■■■■■■

قیصر تمکین (انگلینڈ)

یورپ میں مقیم اردو قلم کاروں کی فہرست میں حیدر قریشی صاحب کا نام اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہ گیا ہے۔ویسے تو انہوں نے مختلف اصناف ادب میں اپنی محنت و ریاضت سے ممتاز جگہ حاصل کی ہے لیکن افسانے کے میدان میں ان کی مساعی واقعی بہت قابلِ لحاظ ہیں بعض بالکل

ہی منفرد خصوصیات کی وجہ سے عصری کہانی کاروں میں ان کا ایک بالکل ہی علاحدہ اور نا قابلِ انکار تشخص متعین ہو چکا ہے۔

....

منزہ یاسمین (بہاول پور)

حیدرقریشی جہاں شاعری میں اپنے فن کو مکمل طور پر منوا چکے ہیں وہاں اُن کے افسانے بھی اُردو ادب میں اپنے منفرد اور جدت وندرت سے بھر پور ہونے کی بناء پر خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

....

مسعود منور (ناروے)

آپ کی کہانیوں سے مجھے کوئی بیتی خوشبو آئی ہے۔ٹھہریئے میں اگر جلا لوں---- میں اگر جلا آیا ہوں اور خوشبو میں بھیگتے ہوئے یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ مجھے آپ کا کہانی بننے کا ڈھنگ نویکلا لگا ہے"۔

....

جمیل الرحمن (انگلینڈ)

(روشن نقطہ) اپنی نوعیت کا بہت خوبصورت اور حیدرقریشی صاحب کی مخصوص چھاپ لگا افسانہ ہے۔میرے محدود علم کے مطابق اس رنگ میں ابھی تک حیدر صاحب سے اچھا افسانہ کسی نے نہیں لکھا۔تصوف اور روحانی واردات کا حسین امتزاج۔

....

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان (پشاور)

ہمارے برخوردار حیدر قریشی۔۔۔میں انہیں مغربی دنیا میں اردو کا سب سے بڑا ادیب مانتا ہوں اور ان کی صلاحیتوں کے سامنے اپنی ہیچ مدانی کا اعتراف کرتا ہوں۔حیدر، ون مین ادبی رائٹنگ کی انڈسٹری ہیں۔پورا رسالہ کمپیوٹر پر ہی بیٹھ کر مرتب کرتے ہیں۔۔میرے برخوردار ہیں۔مجھ سے عمر میں دس برس کم،لیکن کام وصلاحیت میں سو سال بڑے۔

....

نصر ملک (ڈنمارک)

جرمنی میں مقیم اردو ادب کی منفرد و بے مثال شخصیت،حیدر قریشی ہمارے عہد کے وہ ادیب و شاعر اور نقاد و محقق ہیں کہ جنہیں مشرق و مغرب میں اردو ادب کا ایک باقاعدہ انسٹی ٹیوٹ کہا جانا چاہیے۔

....

حیدرقریشی سے متعلق اب تک ہونے والا یونیورسٹی سطح کا تحقیقی کام

۱۔حیدرقریشی شخصیت اور فن۔۔۔۔منزہ یاسمین
(ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ سال ۲۰۰۲۔۲۰۰۰ء) (اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، پاکستان)

۲۔حیدرقریشی شخصیت اور ادبی جہتیں۔۔۔۔ڈاکٹر عبدالرب استاد
(تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی ۲۰۱۳ء) (گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ، کرناٹک، انڈیا)

۳۔حیدرقریشی۔حیات وخدمات انجم آراء
(ایم فل کا مقالہ سال ۲۰۱۳ء) (کلکتہ یونیورسٹی، کولکاتا، انڈیا)

۴۔حیدرقریشی کی ادبی خدمات۔۔۔۔عامر سہیل
(تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اُردو،۲۰۱۴ء) (ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ، پاکستان)

۵۔حیدرقریشی کی شاعری کا مطالعہ۔۔۔ہردے بھانو پرتاپ
(ایم فل کا مقالہ، سال ۲۰۱۴ء) (جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔انڈیا)

۶۔حیدرقریشی کی افسانہ نگاری کا مطالعہ۔۔۔رضینہ خان
(ایم فل کا مقالہ سال ۲۰۱۴ء) (جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔انڈیا)

۷۔حیدرقریشی کی شاعری کی روشنی میں بیرونی ممالک کی اردو شاعری۔''تنقیدی مطالعہ اور ترجمہ''
شعر المهجر عند حيدر قريشي "دراسة تحليلية نقدية مع الترجمة"
احمد عبدربہ عباس عبدالمنعم (ایم اے کا مقالہ سال ۲۰۱۵ء)۔ازہر یونیورسٹی۔قاہرہ،مصر۔یہ مقالہ عربی میں لکھا گیا ہے اور اس کے لیے حیدرقریشی کے چار شعری مجموعوں کا عربی ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔

۸۔مجلّہ ''جدیدادب'' کی ادبی خدمات'' از کنول تبسم

(**ایم فل کا مقالہ**۔سال ۲۰۱۸ء)(وفاقی اردو یونیورسٹی۔اسلام آباد)

۹۔رسالہ ''جدیدادب'' کی ادبی خدمات۔تحقیقی وتنقیدی مطالعہ ازمحمد شعیب

ہزارہ یونیورسٹی۔مانسہرہ۔ (**ایم فل کا مقالہ۔۲۰۱۸ء**)

۱۰۔جدیدادب میں شائع ہونے والے مباحث۔۔۔۔شازیہ حمیرہ

ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ۔۔ سال ۲۰۰۹۔۔۔۲۰۰۷ء۔اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور،

۱۱۔حیدرقریشی بہ حیثیت محقق ونقاد۔۔۔۔صغریٰ بیگم

ایم فل کا تحقیقی مقالہ سال ۲۰۱۶،۔۔وفاقی اردو یونیورسٹی اسلام آباد

۱۲۔حیدرقریشی کی خاکہ نگاری:ایک جائزہ ۔۔کلثوم رقیہ

ایم فل کا تحقیقی مقالہ سال ۲۰۲۱۔۔۲۰۲۳ء۔۔الحمد اسلامک یونیورسٹی۔اسلام آباد

۱۳۔حیدرقریشی کے افسانوں کا مطالعہ۔۔کامران کاظمی۔

پری ایم فل مقالہ۔ سال ۲۰۰۷ء۔

یونیورسٹی مقالات میں حیدرقریشی کا جزوی مگراہم ذکر

۱۔اردو میں ماہیا نگاری از ڈاکٹر صبیحہ خورشید

سال ۲۰۰۹ء۔ناگپور یونیورسٹی،ناگپور،انڈیا سے **پی ایچ ڈی کا مقالہ**

۲۔رحیم یارخان کے جدید شعراء کا تصورِ محبوب از فرزانہ یاسمین۔

سال ۲۰۱۷ء۔نیشنل کالج آف بزنس،ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس لاہور،**ایم فل کا مقالہ**

۳۔''ضلع رحیم یارخان کے شعراء کا خصوصی مطالعہ'' ازمحمد بلال قادر۔

ایم فل کا مقالہ۔نیشنل کالج آف بزنس،ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس لاہور

۴۔''خان پور میں اُردو غزل کی روایت کا تجزیاتی مطالعہ'' از نذیر بزمی۔

ایم فل کا مقالہ۔نیشنل کالج آف بزنس،ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس لاہور

۵۔اُردو میں میراجی شناسی کی روایت کا تجزیاتی مطالعہ ازساجدہ پروین **پی ایچ ڈی کا مقالہ**۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی۔اسلام آباد۔سال ۲۰۱۴ء

۶۔''لالۂ صحرا''۔۔۔''ادب جہاں''۔۔۔''جدیدادب'' کی ادبی خدمات از ثناظہر۔

ایم فل کا مقالہ۔نیشنل کالج آف بزنس،ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس لاہور

حیدرقریشی کی تمام کتابیں اس لنک پر پی ڈی ایف فائلز میں دستیاب ہیں
اورآسانی سے ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہیں۔

https://archive.org/details/@all_books_by_haider_qureshi

اور

حیدرقریشی سے متعلق لکھے گئے یونیورسٹی مقالات،تصنیف اورمرتب کی گئی کتب،رسائل کے نمبرز
اورگوشے وغیرہ کا کافی مواد یہاں دستیاب ہےاورآسانی سے ڈاؤن لوڈ کیا جاسکتا ہے۔

https://archive.org/details/@about_haider_qureshi451